مقالات سر سید

مرتب کی دیگر تالیفات :-

فرہنگِ عامرہ: اردو زبان کی با تلفظ لغت جس کے بارے میں برِ صغیرِ ہند کے مشاہیر اربابِ قلم، اعلیٰ معیاری رسالوں اور نامور اخبارات کی رایوں کے ملخص اس کتاب کے آخیر میں ملاحظہ فرمائیے۔

مرقعِ رباعیات: چالیس متقدر شعرائے اُردو کی رباعیوں کا انتخاب۔

وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ ط

اور چاہیئے کہ ہو تم سے ایک جماعت جو بلاوے طرف بھلائی کے۔

مقالاتِ سرسیدؒ

یعنی

ان علمی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، تعمیری اور اصلاحی مضامین

کا

مجموعۂ انتخاب

جو

پرچہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے

مرتبہ

محمد عبداللہ خاں خویشگی

مؤلف فرہنگ عامرہ و مرقع رباعیات

قیمت چار روپیہ (پاکستانی)

مقالات سرسید کی ترتیب و تبویب و تہذیب کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔
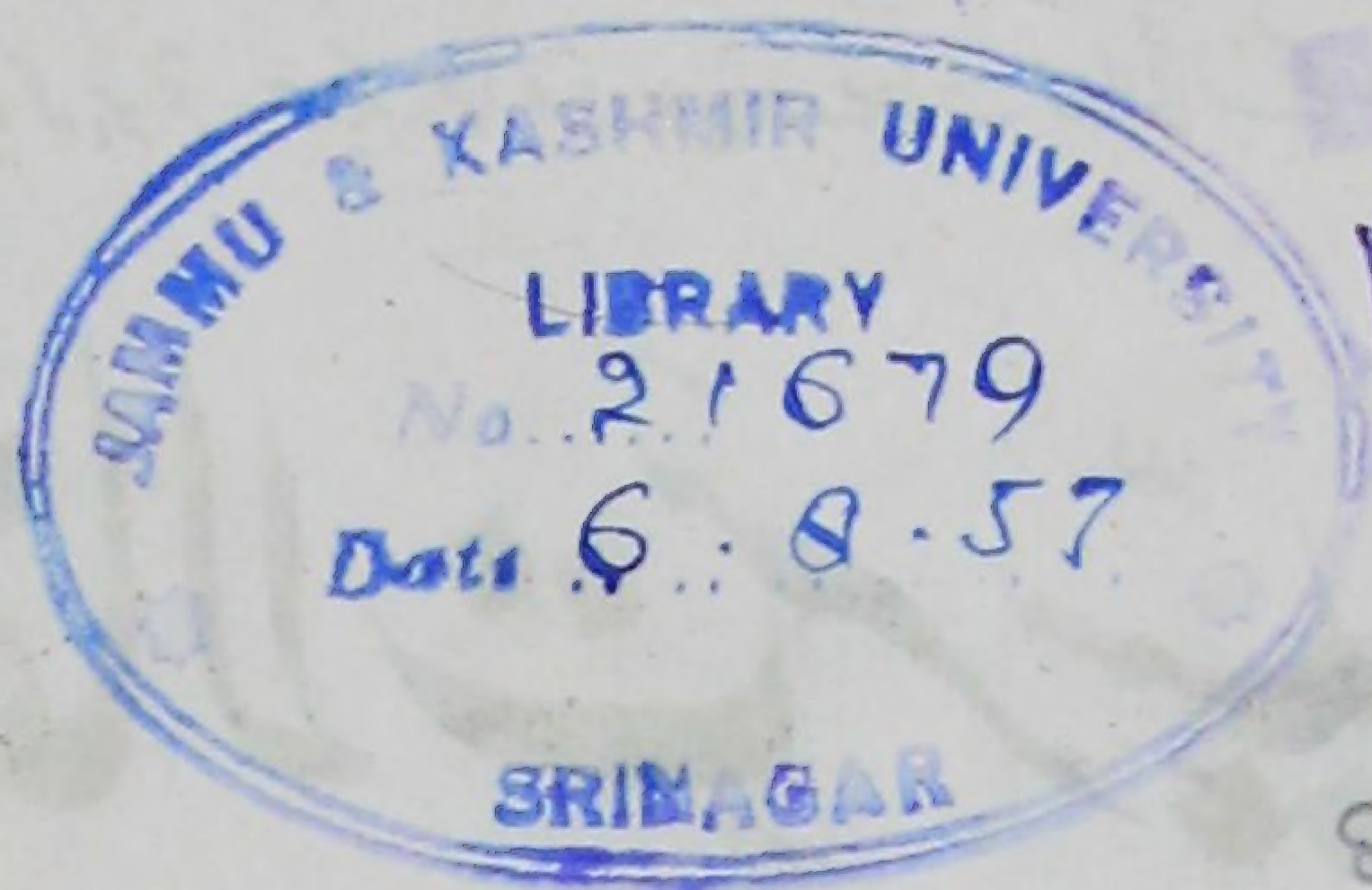
ملنے کا پتہ

محمد عبداللہ خاں خویشگی

فیروز منزل

خورجہ، انڈیا

باہتمام

عزیز حسین منیجر

نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڑھ طبع شد

ملت بیضاء کے نام

جس کی خدمت گزاری میں

سرسیّد

نے اپنی زندگی قربان کر دی تھی

پیش لفظ

سرسیّد کی تمام زندگی جس پُر آشوب زمانہ میں بسر ہوئی، اُس وقت نہ صرف برِ صغیر ہند بلکہ کُل عالمِ اسلام پر تنزل و ادبار کے تاریک بادل چھائے ہوئے تھے۔ یورپ کی اقوامِ نو دولت، جدید علوم فنون سے آراستہ پیراستہ، نت نئے اکتشافات و انکشافات کے ساتھ، مسلمانوں کی فرسودہ حال مملکتوں اور درماندہ حال قوموں کو جہاں جہاں وہ دنیا کے پردے پر آزاد باقی بچی تھیں، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تاخت و تاراج کر رہی تھیں۔

یہ عہد وہ تھا جبکہ فرزندانِ تثلیث، فاتحانہ نخوت سے سرشار، مسلمانوں کے انحطاط اور زوال کا سارا الزام (خاک بدہن شاں) اسلام پر لگا رہے تھے۔ دوسری طرف، پرستارانِ توحید اپنی نو غلامی کی خفت مٹانے کے لئے، علوم و فنون جدیدہ کو "نشانِ عیسائیت" یقین کر کرا اور کرا کر، پڑھنے اور پڑھانے والوں کو مرتد اور گردن زدنی ٹھہرا رہے تھے۔ اس نازک دور میں اسلام کی حمایت اور مسلمانوں کی قیادت کے لئے، چیدہ چیدہ مجدّد و مُصلح پیدا ہوئے، جن میں سیّد جمال الدین افغانی سیّد محمد عبدہٗ مصری اور سر سیّد احمد خاں مشہور و معروف ہیں۔

اسّی برس ہوئے کہ مسلمانوں کی سوشل اصلاح و تجدید کے لئے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا۔ اس ثلث صدی میں گردشِ روزگار نے ملِ حاضرہ کو عروج و زوال کے کیا کیا درس دئے! حیاتِ بشری نے تنزل و ارتقار کے کیسے کیسے سحر کار انقلاب دیکھے! علوم و فنون کے دربار میں کن کن قوموں نے مرتبہ پایا! اختراعات و ایجادات

کا کس کس نے اعجاز دکھایا! تہذیب و تمدن میں کتنا غلو و اوج آیا! کیا تھا اور کیا ہو گیا، بنی نوع انسان کی تاریخ کا یہ ایک بصیرت آموز باب ہے۔

دنیا کی کوئی رفیع الشان عمارت قائم نہیں رہ سکتی جب تک اُس کی بُنیادیں سیلِ حوادث کا تلاطم برداشت کرنے کے لئے عمیق اور استوار نہ ہوں! کوئی سربلند شجر برقرار نہیں رہ سکتا جب تک اُس کی جڑیں بلاخیز آندھیوں کے تھپیڑے کھانے کے لئے گہری اور پائیدار نہ ہوں! کوئی نظام سوسائٹی تنازع البقا کے اس طوفانی مدّ و جزر میں سلامتی سے پار نہیں اُتر سکتا، جب تک اس کی سوشل کشتی کی پناہ گاہیں اخلاقیات کی مستحکم چٹانیں نہ ہوں! تہذیب الاخلاق کے اعلیٰ مضامین کا یہ مجموعہ انتخاب ہمارے ماضی، حال، اور مستقبل کا ایک آئینہ خانہ ہے، جس میں حقیقت شناس مسلمان آنکھیں کھول کر اپنی ہیئت کذائی دیکھیں کہ انہوں نے، تب سے اب تک، مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کتنی ترقی کی ہے، اور اپنی پسماندگی سے عبرت حاصل کریں۔

نصیحت گوش کن جاناں! کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

اخیر میں صرف ایک امر وضاحت طلب ہے: اور وہ یہ کہ سرسیّد نے جہاں کہیں بھی "ہندوستان" لکھا ہے، اُس سے اُن کی مُراد بھارت و پاکستان دونوں ممالک ہیں، کیونکہ فی الواقع یہ برِ صغیر ہند اُن کے زمانہ میں ایک ہی ملک تھا۔

یکم مارچ ۱۹۵۲ء — محمد عبداللہ خاں خویشگی

فہرس

مضامین مرتب

مضامین سرسیّد

مضامین مرتّب

یہ لفظ بالکل غلط ہے یہ تھ- ...
مثلاً تہذیب الاخلاق-

THE
MOHAMMEDAN
SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

وہ اصل سرنامہ جس کا بلاک لندن میں تیار کرا کے سر سید ساتھ لائے تھے

(۵) (۱) حالات پرچہ تہذیب الاخلاق

مسلمانانِ ہند کی اصلاح و ترقّی کی غرض سے، یورپ کی تہذیب و تمدّن اور علوم و فنون کی درسگاہوں کا مشاہدہ کرنے کے لئے جب سر سیّد انگلستان گئے ہوئے تھے، وہاں ان کو انگریزی کے قدیم اصلاحی پرچوں، ٹیٹلر، اسپیکٹیٹر اور گارڈین کے فائلوں کو دیکھنے کا اتفاق پیش آیا، جن میں سر رچرڈ اسٹیل اور جاذف ایڈیسن کے اعلیٰ مضامین سے وہ نہایت متاثر ہوئے! اور اپنے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے ایک ایسا ہی اصلاحی پرچہ اردو میں بھی نکالنے کا ذہن پر عزم راسخ کر لیا۔ چنانچہ ابنِ خازنِ رازی کی شہرۂ آفاق اخلاقی کتاب کے نام پر اپنے اس پرچہ کا نام تہذیب الاخلاق تجویز کیا! اور سرنامہ کا بلاک لندن ہی میں تیار کرا کر ۲۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو اپنے ساتھ لائے، اور واپسی کے تین مہینے کے اندر یہ پرچہ جاری کر دیا۔

تہذیب الاخلاق کا پہلا پرچہ یکم شوال ۱۲۸۷ھ، مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو

شائع ہوا۔ اس کی سات جلدوں میں ایک سو آٹھ نمبر چھپے، جن کے اندر کل دو سو باسٹھ مضامین نکلے، اُن میں ایک سو بارہ صرف سر سید کے لکھے ہوئے تھے۔ اس سلسلے کا اخیر نمبر یکم رمضان ۱۲۹۳ھ، مطابق ۲۰ ستمبر ۱۸۷۶ء کو چھپا اور پھر بند ہوگیا تہذیب الاخلاق کا یہ پہلا دور تھا۔

تین برس خاموشی کے بعد بعض دوستوں اور ترقی پسند مسلمانوں کے اصرار پر سر سید نے پھر تہذیب الاخلاق جاری کیا، جس کا پہلا نمبر یکم جمادی الاوّل ۱۲۹۶ھ، مطابق ۲۳ اپریل ۱۸۷۹ء کو شائع ہوا۔ اس بار چار جلدوں میں کل ستر سٹھ مضامین نکلے، جن میں تیئیس صرف سر سید کے لکھے ہوئے تھے۔ اس سلسلہ کا اخیر نمبر یکم رمضان ۱۲۹۸ھ، مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۸۱ء کو چھپا اور پھر بند ہوگیا۔ یہ دورِ ثانی تھا۔

بارہ سال گزر گئے، کہ دسمبر ۱۸۹۳ء کی محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریر میں مولانا نذیر احمد نے اس پرچہ کے اجرا پر بہت زور دیا، جس کی تائید، یک زبان ہوکر، تمام حاضرین جلسہ نے کی۔ چنانچہ یکم شوال ۱۳۱۱ھ، مطابق ۷ اپریل ۱۸۹۴ء کو اس اخیر سلسلہ کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اس مرتبہ تین جلدوں میں چھتیس نمبر چھپے، جن کے اندر کل ایک سو تیس مضامین نکلے۔ ان میں سے تہتر صرف سر سید کے لکھے ہوئے تھے۔ اس کا اخیر نمبر یکم رمضان ۱۳۱۴ھ، مطابق ۲ فروری ۱۸۹۷ء کو چھپا اور پھر بند ہوگیا۔

جس کے بعد تہذیب الاخلاق کا اپنا کوئی علیحدہ وجود باقی نہ رہا، اور ماہ شوال سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کے اندر شامل کردیا گیا۔ تب سے انسٹی ٹیوٹ کے جن مضامین کی پیشانی پر لفظ "تہذیب الاخلاق" مندرج ہوتا، وہ اس کے قائم مقام متصوّر ہوتے۔ لیکن سر سید کی وفات کے ساتھ ۵ ذی قعدہ ۱۳۱۵ھ، مطابق ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو تہذیب الاخلاق کا یہ نقشِ آخریں بھی ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔ یہ دورِ ثالث تھا۔

اس طرح تہذیب الاخلاق کی کل عمر بارہ سال کے قریب ہوئی، اس پرچہ کا پہلا دور خوب شاندار اور عملی نتائج کے اعتبار سے بڑا کامیاب رہا، جس کے اعلیٰ انقلابی

حالات پرچہ تہذیب الاخلاق

اس زمانہ میں جبکہ سرسید بنارس میں برسرِ ملازمت تھے، اور ان کو فرصت میسر تھی، یہ پرچہ نہایت آب و تاب، اور پورے التزام و اہتمام کے ساتھ، پورے چھ سال تک نکلتا رہا۔ لیکن جب سرسید پنشن لے کر علیگڑھ میں آگئے تو ان کو کالج کی تکمیل، اس کی عمارتیں تیار کرانے، اور دیگر متعلقہ کاموں کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا پڑا۔ اس کے علاوہ، ان کے وہ دوست جو اس پرچہ کے سرگرم مضمون نگار تھے، زیادہ اہم علمی کاموں میں مصروف ہو گئے؛ نیز، مسلمانوں پر جو عام جمود، خمود چھایا ہوا تھا اس میں کافی حرکت پیدا ہو چکی تھی؛ اور اس طرح یہ پرچہ اپنا مشن بہت کچھ پورا کر چکا تھا۔ ان تمام وجوہات سے بادلِ ناخواستہ اس کو بند کرنا پڑا۔

اس پرچہ کے دوسرے دَور میں، جس کی مدّتِ عمر سوا دو سال ہوئی، سرسید کی زیادہ تر توجہ کالج کے معاملات اور قرآن شریف کی تفسیر لکھنے کی طرف منعطف رہی، اور ان کے معاونین کو بھی اس کام میں ہاتھ بٹانے کی مہلت نہ تھی؛ لہٰذا یہ دور پہلے کی برابر درخشاں اور اتنا اثر آفریں ثابت نہیں ہوا۔

اس پرچہ کا تیسرا دَور اور بھی پھیکا رہا: اس مرتبہ کسی دوسرے شخص نے کوئی قلمی اعانت نہیں کی، اور سرسید نے بھی اپنا کوئی مستقل مضمون نہیں لکھا۔ چنانچہ دو سال دس ماہ کی کسمپرسی کے بعد یہ پرچہ اپنا قالب تبدیل کر کر علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں منتقل ہو گیا، جہاں تیرہ مہینے حالتِ احتضار میں گزارنے کے بعد اس کا خاتمہ بالخیر ہوا۔

تہذیب الاخلاق میں، صرف مسلمانوں سے متعلق مفید مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ یہ پرچہ مصوّر نہ تھا اور خبریں یا اشتہار بھی اس میں درج نہیں کئے جاتے تھے۔ اس کی ضخامت کی کوئی حدِ معیّن نہ تھی، جیسا کہ مقتضائے مضامین ہوتا؛ بالعموم آٹھ تا سولہ صفحات پر چھاپا جاتا تھا۔ اس کی اشاعت کا بھی کوئی خاص وقت، یا دن مقرر نہ تھا، بلکہ ہر مہینے میں ایک بار، یا دو بار، یا تین بار، حسب موقع و ضرورت نکالا جاتا تھا۔ سفید دبیز کاغذ کی اٹھارہ بائیس انچ کی ایک ربع تقطیع پر دو کالم اور

ہر کالم کے اندر چھبیس۲۶ سطریں، گیارہ ۱۱ پائنٹ ٹائپ میں انطباع کی جاتی تھیں۔

اس پرچہ کی سالانہ قیمت دورِ اوّل میں چار روپیہ، دوسرے میں ساڑھے چار ۴½ روپیہ، اور تیسرے میں چھ روپیہ پیشگی، مع اخراجات روانگی تھی۔ اور ایک پرچہ چار ۴ آنہ کو آتا تھا۔ مسلمانوں میں جو شخص ساٹھ ۶۰ روپیہ سالانہ پیشگی بطور چندہ دیتا، وہ اس پرچہ کے متعلق معاملات میں ممبر متصوّر ہوتا تھا۔ ان ممبروں کو بلا قیمت یہ پرچہ ملتا تھا، اور ان کو اس کی تقسیم کا بھی، بلا قیمت جسکو وہ چاہیں، اختیار تھا۔ جس قدر روپیہ بابت اس پرچہ کے بطور چندہ، خواہ بطور قیمت وصول ہوتا، وہ کسی خاص شخص کی ملکیت نہ تھا، بلکہ اسی پرچہ کے اجرار ترقی پر صرف کیا جاتا تھا۔

جب تک سرسیّد بنارس میں رہے، یہ پرچہ انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڈھ سے چھپ کر ان کے پاس جاتا اور وہاں سے تقسیم ہوتا رہا؛ لیکن جب علیگڈھ آ گئے، تو تقسیم بھی وہیں سے ہوا کرتا تھا۔ اس کا عملۂ ادارت اور دفتر براہِ راست سرسیّد کی نگرانی میں رہتا تھا، جو اس کے اڈیٹر و منیجر تھے؛ اور جملہ خط و کتابت، روانگیٔ مضامین اور ترسیلِ زر، خود انہی کے نام ہوا کرتی تھی۔

اس پرچہ کے اجرار سے سرسیّد کا مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کی حُسنِ معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو؛ اور جو غلط اوہام مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں، اور در حقیقت مذہب اسلام کے برخلاف ہیں، ان کو رفع کیا جاوے؛ اور اہل یورپ و امریکہ کے اس اعتراض سے کہ اسلام جدید تمدن و ترقی کا دشمن ہے بہ براہین قاطع دامن پاک کیا جاوے؛ قومی تنزل کے باعث عادات و اخلاق میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں، ان سے بطریق احسن مسلمانوں کو متنبّہ کر کے ترقی پر مائل کیا جاوے؛ بیہودہ اور مُضر رسموں سے نفرت دلائی جاوے۔ یونانیوں کی قدیم فرسودہ کتابیں جو ایک زمانہ ہوا کہ تقویم پارینہ بن چکی ہیں، مگر جن کا گہرا نقش مسلمانوں کے دلوں پر اب تک بیٹھا ہوا ہے، ان کی غلطیاں واشگاف بیان کی جاویں۔ علوم جدیدہ اور نئے فنون اور صنعتوں کو حاصل کرنے کی نوجوان مسلمانوں میں ایک لگن لگا دی جاوے؛ اور اس کے ساتھ ہی

اپنے بزرگانِ اسلاف کی عظمت اور ان کے علمی اور عملی کارناموں کی یاد بھی ان کے دلوں میں زندہ رکھی جاوے۔ اُردو زبان کے دقیانوسی اور دور از کار ادب و انشاء کی اصلاح کر کے ہر پہلو سے زمانہ حال کے مطابق ترقی دی جاوے؛ مجلہ نگاری اور اخبار نویسی کی جملہ کوتاہیاں اور عیوب رفع کر کے تعلیمی صلاحیت اور افادی شان پیدا کی جاوے اور مہذب زبانوں کے لٹریچر کے ہم پلہ بنایا جاوے۔ غرض کہ ہر اعتبار سے شعورِ ملی اور احساسِ قومی کی تعمیر کی جاوے۔

تہذیب الاخلاق کے مضمون نگار تو بہت سے لوگ تھے؛ لیکن سر سیّد؛ نواب محسن الملک سیّد مہدی علی خاں؛ نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علیخاں؛ نواب وقار الملک سید مشتاق حسین؛ خواجہ الطاف حسین حالی؛ مولانا ذکاراللہ؛ مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹی، جو فارقلیط نام سے اپنے مضامین چھپواتے تھے؛ اور جسٹس سیّد محمود؛ ان میں خاص طور پر ممتاز و نمایاں تھے۔ ان تمام صاحبوں کے مضامین زیادہ تر مذہب یا وقتی مسائل کے بارے میں ہوتے تھے؛ لیکن خود سر سیّد، مذہب، اپنی اصلاحی تحریکات، اور ہنگامی معاملات کے سوا، اخلاق، معاشرت، اور تمدّن پر بھی بیشتر مضامین لکھتے تھے، جنکا یہ مجموعۂ انتخاب آپ کے پیشِ نظر ہے۔

چونکہ یہ پرچہ برصغیر ہند کے تنزل یافتہ اور زوال پذیر مسلمانوں پر اسلام کو ایسی صورت میں ظاہر کرتا تھا، جو عام رُجحانات اور معتقدات کے برخلاف تھی؛ اور وہ صدائیں اٹھاتا تھا، جن سے اُن کے کان اب تک بالکل ناآشنا تھے، اس لئے ابھی صرف دو یا تین ہی نمبر اس کے نکلنے پائے تھے کہ تمام عناصر ملت میں ایک کھلبلی پڑ گئی۔ جس سے موقع پاکر غرضمندوں نے اپنی تن پروری کے لئے فائدہ اٹھانا چاہا، اور ہزاروں افترا اور بہتانوں سے ان فتنہ پردازوں نے اس پرچہ کو بدنام کر کر مسلمانوں میں ایک عام سوءِ ظن پھیلا دیا۔

بیچارے ناواقف مسلمان عوام، جن کی بھاری اکثریت ایک پسماندہ قوم میں ناخواندہ ہوا کرتی ہے، اُن مفتریوں کے جال میں سب سے زیادہ آئے۔ اُمراء کو

اپنی سرمستیوں اور رنگ رلیوں میں ان باتوں کی فرصت ہی نہ تھی۔ لکھنؤ اور دہلی کی نواح میں بھی، جہاں کے مسلمانوں کی سوسائٹی زوال و ادبار کی جیتی جاگتی تصویروں کا ایک مرقع بن چکی تھی، اس پرچہ کا اثر بہت کم ہوا۔

تہذیب الاخلاق ایک نہایت اعلیٰ معیار کا گرانقدر سوشل رسالہ تھا۔ اس کے اجرار کا منشا ہر چند مذہبی اصلاح نہ تھا، مگر جو باتیں مسلمانوں کی دُنیوی ترقی کی مانع تھیں، وہ اکثر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں؛ اسلئے اس میں مذہبی بحثیں کرنی لازم آپڑتی تھیں۔ اس پرچہ کے اغراض و مقاصد کو پورے کرنے کے لئے سرسید، سید مہدی علی اور مولوی چراغ علی نے خاص طور پر عمدہ مضامین بکثرت تحریر کئے؛ اور ان میں صرف اپنی رائے اور اجتہاد ہی سے کام نہیں لیا، بلکہ جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا، وہ زیادہ تر محققینِ اسلام کی تصنیفات سے اِستناد کرکے لکھا۔ اس کے علاوہ اخلاق، معاشرت اور تمدن کے متعلق یورپ کے مشہور مصنفوں کے خیالات سے بھی جہاں تک ممکن ہو سکا اپنے مضامین میں استفادہ کیا۔

اس پرچہ میں ہر ایک بات بڑی سنجیدگی اور نرمی سے بیان کی جاتی تھی۔ کسی خاص شخص کی جانب روئے سخن بہت کم ہوتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کی عام حالت پر بطور دلسوزی کے، نہ بطور طعن و تشنیع و تفضیح کے۔ بحث کی جاتی تھی۔ اس میں ظرافت کی چاشنی بھی ہوتی تھی، مگر نہ اتنی زیادہ کہ تلخ ہو کر گلوسوز بن جاوے۔ مخالفوں کے شکوک بیجا، اعتراضات، حتیٰ کہ افتراء اور بہتان کے جوابات بھی کسی خاص ضرورت کے سوا نہ دئے جاتے تھے، اور اس لئے یہ پرچہ بحث و مباحثہ اور جواب در جواب کی آلودگیوں سے منزہ اور مبرا تھا۔ اس کے جاری کرنے کے اغراض و مقاصد ہی اچھی اور مفید باتیں بطور صلاحِ نیک کانوں میں ڈالنا، نہ کہ سب و شتم سے مرعوب کرکے زبردستی منوانا، تھے۔

رفتہ رفتہ، تہذیب الاخلاق کے مطالعہ سے ایک بہت بڑا گروہ ایسا بھی ہر طرف ملک میں پیدا ہونے لگا جو اس پرچہ کا نہایت ہی دلدادہ اور قدردان تھا۔ یہ متوسط

طبقہ کے مسلمان تھے، جو نہ تو عوام جہلا ر کی طرح خود غرضوں کے ہاتھوں میں آلہ کار تھے، اور نہ عیاش امرار کی مانند بادۂ غفلت میں سرشار۔ یہ لوگ اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتے تھے، جبکہ انہوں نے اپنا مستقبل تاریک اور دنیوی ترقی کے دروازے اپنے اوپر بند پائے، تو ان کی افسردہ طبیعتیں اپنے روز افزوں تنزل کے سبب، ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح کوئی سہارا ڈھونڈھنے لگیں، جس سے ان کی ڈھارس بندھے اور مسلمانوں کے حق میں کوئی فلاح کی صورت نظر آئے۔ دیکھا کہ ایک ناصح مشفق کمال دلسوزی سے اُن کو نیند سے جگا تا ہے، ان کی غفلت پر نرمی سے ملامت کرتا ہے، ان کے اسلاف کے کارنامے سُنا کر اُن کو غیرت دلاتا ہے، اور ان کو ترقی کرنے کی راہ دکھاتا ہے، تو یہ اس کی پکار پر لبیک! لبیک!! کہتے ہوئے دوڑے۔

تہذیب الاخلاق نے ان کے دل پر وہی کام کیا جو مرہم زخم پر کرتا ہے۔ یہ لوگ اس پرچہ کے انتظار میں ہمہ تن چشم رہتے، اس کے اصلاحی مضامین پڑھ پڑھ کر وجد کرتے، اور اس کے مخالفوں کو تعجب کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان ہی دوراندیش اور حقیقت شناس دردمندوں نے سرسید کی دل کھول کر اعانت کی۔ اس گروہ کی صف اول میں فرزندانِ پنجاب تھے، جن کے بارے میں خواجہ حالی لکھتے ہیں:—

"ایک خداساز تائید سرسید کے منصوبوں کی یہ ہوئی کہ پنجاب کے مسلمان سرسید کی منادی پر اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر دوڑتا ہے۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کہ مدرسۃ العلوم کو مالی مدد پہونچائی، بلکہ سچ یہ ہے کہ سرسید اور ان کے کاموں کی کسی صوبہ نے عام طور پر ایسی قدر نہیں کی جیسی پنجاب والوں نے کی۔ کالج میں انہوں نے ہر ایک صوبہ سے زیادہ لڑکے تعلیم کے لئے بھیجے! ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انہوں نے سب سے زیادہ دلچسپی ظاہر کی! سرسید کی ہر قسم کی اصلاحیں انہوں نے سب سے زیادہ قبول کیں! اور قوم کی بھلائی کے کاموں میں سب سے بڑھ کر انہوں نے سرسید کی تقلید اختیار کی! یہاں تک کہ ان کو "زندہ دلانِ پنجاب" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ ہندوستان کے اور حصوں کی طرح انہوں نے سرسید کو

وقائع علمی زندگی

اے کہ آگاہ نۂ حالتِ درویشاں را
تو چہ دانی کہ چہ سودا دسراست ایشاں را

اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں، برِصغیرِ ہند کے افقِ سیاست پر ظلمت چھائی ہوئی تھی، اور اس ظلمت کے بطن سے مغرب بعید کے اولوالعزم ملاحوں کی ایک تجارتی جماعت کا نیرِ اقبال آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا، جس کی تابانی سے عظیم الشان مغلوں کے سپہرِ سلطنت کا کوکبۂ حشمت فق ہوتا جاتا تھا؛ یہاں کے مسلمانوں پر ادبار منڈلا رہا تھا، اور ان کی وہ تمام صلاحیتیں اور خوبیاں من حیث الملت رخصت ہو چلی تھیں، جو اقبالمند اور عروج یافتہ قوموں کا خاصّہ ہیں؛ عین اس وقت مشیّتِ الٰہی نے ایک ایسا جامع کمالاتِ انسان ہمارے درمیان پیدا کیا، جس کے سحابِ قلم کی بارشوں اور حُسنِ عمل کی کاوشوں نے نہ صرف ملّتِ بیضا کے کمھلائے ہوئے چمن کی آبیاری کی، بلکہ اس خطّے کی امتِ مرحومہ میں نشاۃ الثانیہ پھونک دی —— شخص جوّاد الدولہ، عارف جنگ سر سیّد احمد خاں تھا۔

سیّد احمد خاں ۵ رذی الحجہ ۱۲۳۲ھ، مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو، شہر دہلی میں تراہہ بیرم خاں کے قریب اپنے نانا خواجہ فرید کی حویلی کے اس حصّہ کے اندر جو خواص پورہ کہلاتا تھا، ایک سربرآوردہ خاندانِ سادات میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ دو بھائی اور ایک بہن تھے؛ بھائی کا نام سیّد محمد خاں، اور بہن کا صفیۃ النساء بیگم تھا۔ ان کے والد سیّد متقی جن کا سلسلۂ نسب پینتیس ۳۵ واسطوں سے آنحضرت صلعم تک پہونچتا ہے، بادشاہ کے مقرب تھے: ان کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں نہایت نامور اور صاحبِ علم و فضل تھے؛ خصوصاً ریاضی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

مسلمانوں کی صرف دُنیوی ترقی کا خواستگار، مگر دین کا مخرب، نہیں ٹھہرایا؛ بلکہ ان کو دُنیا اور دین دونوں کا سچا خیرخواہ اور خیر اندیش سمجھا۔ حق یہ ہے کہ قومی خدمات کی داد جو قوم کی طرف سے سر سید کو ملنی چاہیئے تھی، اس کا حق پنجاب کے مسلمانوں کی برابر کسی صوبہ سے ادا نہیں ہو سکا۔"

تہذیب الاخلاق کی مقبولیت اور کامیابی کے بہت سے ظاہری اور معنوی اسباب تھے۔ ان میں سب سے اہم سبب سر سید کی جامع صفات شخصیت تھی، جس کے اندر مبدء فیاض نے وہ تمام محاسن اور اوصاف کوٹ کوٹ کر بھر دئے تھے کہ جو ایک مجدد وقت اور مُصلح قوم میں ہونے ضروری ہیں: ان کی وہ مستثنیٰ قابلیت؛ وہ ہمہ گیر صلاحیت؛ وہ بے لوث قومی ہمدردی؛ وہ بے باک صداقت کہ جس بات کو اصولاً بہتر سمجھتے، اگرچہ سارا زمانہ بھی خلاف ہوتا، اس کو ظاہر کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کرتے تھے؛ وہ قوتِ عمل جس نے علیگڑھ کے بیابانوں میں مسلم یونیورسٹی کی عظیم الشان شکل میں ظہور کیا؛ وہ اعتماد علی النفس جس کے بارے میں ایک مرتبہ انہوں نے سید مہدی علی کو لکھا تھا:—

"جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے، دوں دوں نیکی بڑھتی گئی ہے۔ پس اگر میرا کاربار سچا اور میری نیت نیک ہے، تو انشاء اللہ اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا۔"

یہ تمام خوبیاں نہ صرف پرچہ تہذیب الاخلاق، بلکہ زندگی کے گوشہ گوشہ میں سر سید کی نُصرت و کامیابی کی ضامن تھیں۔

اس زمانہ میں جیسا کہ مسلمان اشراف بچوں کی تعلیم کا عام دستور تھا، سیّد احمد خاں محلہ کے مکتب میں قدیم فارسی نصاب کی کتابیں پڑھ کے اٹھارہ [18] سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ انھی ایام میں ان کے بڑے بھائی سیّد محمد خاں نے اردو زبان کا غالباً پہلا پرچہ "سیدالاخبار" نام سے جاری کر رکھا تھا، جس میں یہ بھی مقالہ نگاری کرنے لگے؛ اور اس طرح سید احمد خاں کی مضمون نویسی کا آغاز ہوا۔ یہ وہ عہد تھا جبکہ تمام قوم بادۂ غفلت میں سرشار تھی؛ عیش و نشاط کی رنگین محفلیں شبانہ روز گرم رہتی تھیں اور عاشقانہ شاعری کی دھوم تھی۔ چنانچہ یہ بھی مشاعروں میں جاکر طبع آزمائی کرتے؛ ایک مختصر سی مثنوی بھی لکھی، تخلّص "آہی" اختیار کیا تھا۔ غرض اُنکے یہ تین [3] چار سال خوب رنگ رلیوں میں بسر ہوگئے۔

۱۸۳۸ء میں یکایک ان کے والد کی وفات ہوگئی اور خانگی تفکرات سے مجبور ہو کر ان کو تلاش معاش کرنی پڑی۔ چنانچہ ان کے خالو، مولوی خلیل اللہ خاں نے، جو دلّی کے صدر امین تھے، ان کا تقرر اپنے یہاں کی سررشتہ داری پر کر دیا۔ ۱۸۳۹ء میں یہ آگرے جاکر دفتر کمشنری میں نائب منشی کے عہدہ پر فائز ہوگئے، جہاں دو [2] ڈھائی سال تک متعین رہے۔ یہاں آگرہ میں انہوں نے اپنی سب سے پہلی تالیف، فارسی کی ایک تاریخی فہرست "جامِ جم" ۱۸۴۰ء میں انطباع کرائی۔ اسی زمانۂ قیام میں منصفی کے امتحان کے امیدواروں کے لئے قوانین دیوانی کی تلخیص کی اور اپنے بھائی سید محمد خاں کو شریک قلم بناکر "انتخاب الاخوین" نام سے چھپوائی، جو اُن کی دوسری تالیف تھی۔

۱۸۴۱ء کے ماہ دسمبر میں منصفی کا امتحان پاس کر کے مین پوری میں تعینات ہوئے مگر جنوری ۱۸۴۲ء میں وہاں سے تبدیل ہو کر فتح پور سیکری ضلع آگرہ میں آگئے جہاں چار [4] سال کے قیام میں تین [3] فارسی رسالوں کے ترجمے شائع کئے۔ ان میں "جلاء القلوب" اور "تحفۂ حسن" دو [2] کا موضوع مذہبی تھا، باقی تیسرا علم جرّ ثقیل میں تھا۔ انھی ایام میں دلّی کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ 'ظفر' نے ان کا موروثی خطاب "جواد الدولہ" باضافہ "عارف جنگ" عطا کیا۔

جس زمانہ میں سید احمد خاں فتح پور سیکری میں منصف تھے، سید محمد خاں ہنگام ضلع فتحپور میں منصف تھے۔ ۱۸۴۵ء میں یہ دونوں بھائی اپنی ماں کے پاس دلی آئے ہوئے تھے، جہاں سید محمد خاں کا بعارضۂ بخار عین عالم شباب میں اچانک انتقال ہو گیا۔ سید احمد خاں کو بھائی سے بہت محبت تھی۔ اس ناوقت موت کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ اُفتادِ طبیعت بالکل ہی منقلب ہو گئی۔ اب رنگین مزاج نوجوانوں کی صحبت سے نفرت پیدا ہونے لگی: رندانہ سج دھج ترک کر کے نیچا کرتا پہن لیا؛ پائجامہ متشرع کر لیا؛ سر کے بال منڈا لیئے؛ ڈاڑھی چھوڑ دی اور پوری "دیوبانہ وضع قطع" اختیار کر لی۔ ان کی والدہ کو بھی بیٹے کی جواں مرگی کا سخت اندوہ و ملال ہوا، جس کی وجہ سے سید احمد خاں نے فتح پور سیکری سے دلی کو اپنا تبادلہ کرا لیا! اور اس طرح ایک ثقہ و صالح جوان بنکر وہ پھر اپنے وطن میں آ گئے۔

۱۸۴۶ء کے ماہ فروری میں، جب سید احمد خاں بہ عہدۂ منصف دلی آئے، تو ان کی عمر انتیس ۲۹ سال تھی۔ یہاں وہ نو ۹ برس تک متعین رہے۔ ابھی تک یہاں علوم قدیمہ کا چرچا تھا، اور جید اساتذہ موجود تھے، جن سے انہوں نے عربی اور فارسی کی بہت سی کتب متداولہ کی تحصیل کی اور قرآن مجید کی سند لی؛ اس کے بعد وہ تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مستغرق ہو گئے۔ انھوں نے اپنے مرحوم بھائی کی یادگار "سید الاخبار" کا دوبارہ اجرا کیا جس میں بالعموم خود ہی مضامین سپردِ قلم کیا کرتے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں انھوں نے اپنی پہلی معرکۃ الآرا تصنیف "آثار الصنادید" اپنے لائق فائق دوست مولنا امام بخش صہبائی کی قلمی اعانت سے شائع کی؛ اور پھر اس کا دوسرا اڈیشن بہت سے اضافوں کے ساتھ ۱۸۵۴ء میں انطباع کرایا، جس کا ترجمہ مشہور فرانسیسی مستشرق "گارسان دی تاسی" نے فرنچ زبان میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ دہلی کے دوران قیام میں سات مستقل اردو رسائل، فوائد ۱ الافکار فی اعمال الفرجار، مترجمہ ۱۸۴۶ء؛ کلمۃ ۲ الحق، مؤلفہ ۱۸۴۹ء؛ راہِ ۳ سنت در ردِّ بدعت، مؤلفہ ۱۸۵۰ء؛ نمیقہ ۴ در بیان مسئلہ تصوّرِ شیخ، مؤلفہ ۱۸۵۲ء؛ سلسلۃ ۵ الملوک، مرتبہ ۱۸۵۲ء؛ آغاز ۶ کیمیائے سعادت کے چند اوراق کا اُردو ترجمہ، مرقومہ ۱۸۵۳ء؛ قول ۷ متین در ابطال حرکت زمین؛

ریاضی؛ مذہب؛ تاریخ اور جغرافیہ میں چھپوائے؛ جن میں آخرالذکر رسالہ قدمائے یونان کے عام نظریہ کی تائید میں زمین کو ساکت ثابت کرنے کے لئے لکھا تھا، اگرچہ بعد کو وہ کرۂ ارض کی گردش کے معترف ہو گئے تھے۔

جنوری ۱۸۵۵ء میں ترقی پاکر بجنور کی صدر امینی پر پہونچے جہاں انہوں نے نہایت محنت اور تحقیق سے ضلع بجنور کی تاریخ مرتب کی؛ جس کے بعد ابوالفضل کی "آئینۂ اکبری" کی پہلی اور دوسری جلدیں بہت صحت و اہتمام کے ساتھ انطباع کرائیں۔ تیسری جلد کا مسودہ ایک بسیط اور محققانہ دیباچہ کے ساتھ، جو بجائے خود ان کا ایک تاریخی شاہکار تھا، دہلی کے ایک مطبع میں زیرِ طبع تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں تلف ہو گیا؛ اور ضلع بجنور کی تاریخ کا مسودہ بھی اسی چپقلش میں آگرہ کے اندر ضائع ہو گیا۔

اس جنگ میں انگریزوں کو کامرانی اور فرزندانِ وطن کو ناکامی نصیب ہوئی: دلّی کا آخری مغل بادشاہ ذلت و رسوائی کے ساتھ مقیّد کر کے رنگون بیجا گیا اور اس کا خاندان انگریز سولجروں کے ہاتھوں تہ تیغ کر دیا گیا؛ لاکھوں بے گناہوں کا قتل عام ہوا؛ ہزاروں اعلیٰ خاندان ملیامیٹ کر کے، ان کی دولت اور جائداد غصب کر لی گئی۔ ہندوستانیوں پر یہ خونچکاں مظالم، اور بالخصوص مسلمانوں کی بربادی، دیکھ کر سید احمد خاں کا دل ٹوٹ گیا انہوں نے چالیس سال کی عمر میں زندگی سے بیزار ہو کر اپنا وطن مالوف چھوڑنے اور مملکتِ مصر میں جا کر سکونت اختیار کر لینے کا عزم صمیم کر لیا۔ میر صادق علی اور میر رستم علی، رئیسانِ اعظم چاندپور ضلع بجنور صوبہ یو۔پی۔ کا زبردست علاقہ بجرم بغاوت ضبط کر کے، انگریزوں نے جب سید احمد خاں کو، تعلقہ "جہان آباد" جو اس وقت ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا، دینا چاہا تو ان کے دل کو نہایت صدمہ پہونچا، اور انہوں نے اس کے لینے سے بالکل صاف انکار کر دیا۔ ایک لیکچر کے دوران میں، جو ۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کو ایجوکیشنل کانفرنس کے جلاس میں دیا، انہوں نے اپنے احساسات قلب ان الفاظ میں ظاہر کئے تھے:—

"میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق کوئی دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا،

اور کہا کہ میرا ارادہ اب ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی، اور کچھ عزت پائے گی۔ اور جو حال اس وقت قوم کا تھا، مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا! اور میرے بال سفید کر دئے۔ جب میں مراد آباد آیا، جو ایک بڑا غمکدہ ہماری قوم کے ریسون کی بربادی کا تھا، اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی! مگر اُس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیئے، اور جو بھی مصیبت پڑے، اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف، اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

۱۸۵۸ء میں صدر الصدور کے عہدے پر ترقی پا کر سید احمد خاں مراد آباد آئے۔ اب پھر ان کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوا: ان کا مقصودِ زندگی ملت کی فلاح و بقا کی جدّ و جہد! اور ان کا موضوع قلم، قوم کی اصلاح و تہذیب، بن گیا۔ مراد آباد پہونچکر انھوں نے سب سے پہلے "تاریخ سرکشی بجنور" شائع کی۔ ۱۸۵۹ء میں رسالہ "اسباب بغاوت ہند" انطباع کیا۔ ۱۸۶۰ء میں، رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" (وفادار مسلمانان ہند) جاری کیا جو صرف تین۳ شماروں میں بقدر ۲۷۳ صفحات ایک سال تک شائع ہو کر بند ہو گیا۔ ۱۸۶۱ء میں انھوں نے رسالہ "تحقیق لفظ نصاریٰ" چھپوایا۔ ان تمام قلم رانیوں کی علت غائی، انگریزوں کی حکومتِ جابرہ کا بغض و عناد رفع کرکے جو مسلمانوں سے تھا، اپنی معاشرتی اور تعلیمی اصلاحات کے لئے میدانِ عمل ہموار کرنا تھی۔ اسی سال سرسید کی محبوب بیوی کا انتقال ہو گیا، جنھوں نے اپنی یادگار سید حامد، سید محمود دو۲ بیٹے اور ایک صغیر سن بیٹی چھوڑی۔ اس وقت سید احمد خاں کی عمر صرف چوالیس۴۴ سال تھی، ان کے قوائے جسمانی غیر معمولی توانا اور مضبوط تھے۔ لیکن انھوں نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی عمر کا افضل ترین حصّہ محض تجرّد میں کمال عفت اور پارسائی کے ساتھ قومی

خدمات کی نذر کر دیا۔

۱۸۶۲ء کے ماہ مئی میں سید احمد خاں کی تبدیلی مراد آباد سے غازی پور کو ہوگئی جہاں انہوں نے انجیل کی تفسیر، عہد عتیق میں سے کتاب پیدائش کے گیارھویں باب تک، اور عہد جدید میں سے انجیل متی کے پانچویں باب تک، اسلامی زاویہ نگاہ سے مرتب کرکے اردو متن اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ "تبیین الکلام" کے نام سے شائع کی۔ ۱۸۶۲ء میں انہوں نے "سائنٹیفک سوسائٹی" غازی پور میں قائم کی جس کا نصب العین اعلیٰ معیار کی اصل قدیم کتابوں اور علوم جدیدہ کی مفید انگریزی کتابوں کے ترجمے کرا کے چھپوانا تھا۔ چنانچہ غازی پور ہی میں اس سوسائٹی نے اپنا کام باقاعدہ شروع کر دیا۔

۱۸۶۴ء میں ان کا علیگڈھ تبادلہ ہوگیا، وہ شہر جس کی عزت اور شہرت خدا تعالیٰ نے ان کی ذات سے وابستہ کی تھی۔ سید احمد خاں اپنے ساتھ سوسائٹی کا تمام ساز و سامان اور عملہ بھی غازی پور سے علیگڈھ لے آئے۔ اسی سال ان کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کا اعزازی رکن منتخب کیا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں انہوں نے اپنی سوسائٹی کا آرگن، ایک اخبار نکالا جو "علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے ان کے دم بازپسیں تک جاری رہا اور جس میں ہمیشہ سید احمد خاں کے گراں قدر شاہکار شائع ہوتے رہے۔

۱۸۶۷ء کے ماہ اگست میں ان کو جج کے عہدے پہ ترقی دے کر علیگڈھ سے بنارس کو منتقل کر دیا گیا، جہاں انہوں نے رسالہ "احکام طعام اہل کتاب" چھپوایا۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو ایک طویل رخصت پر وہ بنارس سے انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس سفر کی غرض و غایت انگلستان کے کوائف کا مشاہدہ کرکے اپنے پسماندہ ہموطن مسلمانوں میں جدید تمدن و تہذیب اور علوم و فنون کو رواج دینا تھی۔ لندن پہنچ کر ایک تقریب میں ان کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور تمغہ عطا کیا گیا۔ یہاں کے قیام میں انہوں نے اپنی مایۂ ناز تصنیف "خطبات احمدیہ" شائع کی، اور ہندوستان میں برطانوی دورِ حکومت کے ناقص طریقۂ تعلیم پر ایک پمفلٹ بزبان انگریزی چھپوایا۔ اپنے سفر کے حالات اور تاثرات انگلستان سے بھیجکر ہندوستان کے جرائد و صحائف میں درج کرائے، تاکہ اہل وطن کو تہذیب یافتہ ممالک کے حالات سے

آگاہی ہو۔ اس طرح ڈیڑھ برس انگلستان کی سیاحت کے بعد ۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو واپس آئے، اور اسی ماہ کے اخیر میں بنارس پہونچ کر پھر اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔

انگلستان کے سفر سے واپسی پر سرسید کی زندگی کی پھر کایا پلٹی: اب انھوں نے مولویانہ وضع ترک کر کے، ترکی پوشاک پہن لی! اور قدیم ہندوستانی معاشرت چھوڑ کر مغربی بود و باش اختیار کرلی! اور اپنی قوم کے اندر بھی جدید تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت پھیلانے کے لئے، انھوں نے پرچہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔

۱۸۷۶ء میں سرسید اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوکر مستقل طور پر علیگڈھ آگئے۔ یہاں مدرسۃ العلوم کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے اور دیگر مہتم بالشان امور متعلقہ کی بجاآوری میں ایسے منہمک ہوئے کہ پھر ان کو قلمی کاموں کی جانب توجہ کرنے کی مہلت بہت ہی کم نصیب ہوئی۔ حالانکہ وظیفہ پانے کے بعد وہ کامل بائیس۲۲ سال بقید حیات رہے! لیکن اس تمام طویل مدت میں قرآن شریف کی تفسیر مرتب کرنے، یا کبھی تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھ لینے کے سوا انھوں نے اور کوئی بڑا علمی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔

باینہمہ کثرت کار و ہجوم افکار، ان کو جب بھی مہلت میسر آتی، کوئی مضمون یا آرٹکل ضرور لکھتے۔ وفات سے دو۲ مہینہ پہلے سے ان کو چُپ لگ گئی تھی۔ عزیز ترین احباب ان کے پاس گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے، صحبت کا لطف قطعی جاتا رہا تھا۔ ایک دن سید زین العابدین خاں نے پوچھا کہ آپ ہر وقت خاموش کیوں رہنے لگے ہیں؟ سرسید نے جواب دیا:—

"اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا! اس لئے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔"

لیکن اس حالت میں بھی انھوں نے اشہب قلم کی عنان نہیں روکی! اور مرنے سے صرف آٹھ دن پہلے، اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی حمایت میں گورنمنٹ کو خود اپنے ہاتھ سے خطوط لکھے۔ اور اس مقصد سے حامیان اردو کی جو کمیٹی قائم ہوئی تھی اس کو اپنی قلمی اعانت کا ہر طرح یقین دلایا۔ حتی کہ جب ان کا انتقال ہوا تو دو۲ مضامین "ازواج مطہرات" اور

"قومی زندگی اور موت" کے مسودے ناتمام چھوڑ گئے، جن میں آخر الذکر کا عنوان ان کے لٹریری اسسٹنٹ سکریٹری وحید الدین سلیم پانی پتی کا قائم کردہ ہے۔

اب ان کی عمر اسّی سال کی ہو چکی تھی۔ ۲۴ مارچ کو بھلے چنگے بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک احتباس بول کا عارضہ لاحق ہوا۔ فوراً طبی امداد حاصل کی گئی۔ لیکن ڈاکٹروں اور اطبا رکی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ تیسرے دن شام سے حالت غیر ہونی شروع ہو گئی۔ چوتھے دن صبح سے نہایت سخت درد شروع ہوا، اسی روز سات بجے شام کو شدید لرزہ کے ساتھ بخار چڑھا، تھوڑی سی دیر میں ہذیانی صورت پیدا ہو گئی، اور احتضار کی علامات نمایاں ہونے لگیں۔ تین گھنٹے کی سخت کرب اور بے چینی کے بعد ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء، مطابق ۵ ذیقعدہ ۱۳۱۵ھ کو رات کے دس بجے، اپنے دوست حاجی اسمٰعیل خاں کی کوٹھی میں، جہاں دس بارہ یوم پہلے حالت صحت میں اپنے بیٹے سید محمود کی کوٹھی سے اٹھ آئے تھے، راہگرائے عالم بقا ہوئے! اور علیگڈھ یونیورسٹی کی مسجد کے شمالی پہلو پر جو تھوڑی سی جگہ مسجد کی حد سے خارج اس کے احاطہ کے اندر بیکار پڑی تھی وہاں اگلے دن ۲۸ مارچ کو عصر اور مغرب کے درمیان سپرد خاک کئے گئے۔

سرسید کا رنگ نہایت سرخ و سفید؛ پیشانی بلند؛ سر بڑا اور موزوں؛ بھویں جدا جدا؛ آنکھیں روشن، نہ بہت بڑی نہ چھوٹی؛ ناک نسبتاً چھوٹی؛ کان دراز؛ گلے میں آگے کو دائیں جانب بڑی رسولی لٹکتی ہوئی؛ ڈاڑھی خوب گھنی اور لمبی جس کے اندر یہ رسولی ہمیشہ چھپی ہوئی رہتی تھی؛ ہڈی چکلی؛ سینہ چوڑا؛ جسم بہت فربہ لیکن ٹھوس؛ ہاتھ پاؤں اور دیگر تمام اعضا نہایت مضبوط اور زبردست؛ قد چھ فٹ سے بھی زیادہ لمبا؛ وزن ساڑھے تین من تھا۔ عنفوانِ شباب میں رسولی نہ تھی، اور بدن بھی اتنا بھاری نہ تھا۔ ان کے بڑھاپے کی وجاہت صاف دلالت کرتی تھی کہ کبھی جوانی میں نہایت حسین اور خوبصورت ہوں گے۔

ان کی صحت بڑھاپے میں بھی غیر معمولی اچھی تھی۔ عفت، پرہیزگاری، محنت اور خورد و نوش میں مناسب احتیاط نے ان کے مزاج کو اور بھی زیادہ اعتدال پر قائم رکھا۔

بینائی آخر تک عمدہ رہی۔ اگرچہ عینک لگانے کی عادت ہوگئی تھی؛ لیکن دن ہو یا رات، نوشت و خواند کا کام مثل جوان آدمیوں کے بے تکلف کرتے تھے اور تکان محسوس نہ ہوتا تھا۔ ہاں بالکل آخری ایام میں بیمار رہنے لگے تھے؛ نشست و برخاست میں دشواری پیش آنے لگی تھی؛ نسیان بھی بڑھ گیا تھا؛ کسی جلسہ میں کھڑے ہوکر دو چار منٹ سے زیادہ تقریر نہیں کرسکتے تھے؛ چلنا پھرنا مشکل ہوگیا تھا؛ دانت شکستہ اور ریختہ ہوگئے تھے؛ خوراک گھٹ گئی تھی؛ البتہ بعد طعام دونوں وقت پاؤ پاؤ سیر دودھ پی لیتے، اور پھر پیسہ دو پیسہ بھر چنے یا دال سیو کھاکر منہ صاف کرلیتے تھے۔

کسی قسم کی مسکرات کا استعمال انھوں نے مدت العمر نہیں کیا۔ انگلستان جانے سے قبل پان تمباکو کھانے، اور حقہ پینے کی بہت زیادہ عادت تھی؛ لیکن اس کے بعد پان کھانا بالکل ترک کردیا تھا، اور حقہ کی بجائے سگرٹ پینے لگے تھے۔ آبادی سے علیٰحدہ کوٹھی بنگلوں میں رہائش اختیار کرلی تھی، جس کا ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ وہ ہندوستانی سوسائٹی کے جھمیلوں میں پڑے رہ کر کوئی بڑا کام سکون و یکسوئی سے سرانجام کو نہ پہونچا سکتے تھے۔

ان کے سوانح حیات پر نظر ڈالنے سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ فطرتاً علم دوست تھے۔ انھوں نے تمام عمر ملازمت میں بسر کی؛ لیکن اپنے فرائض منصبی کی اہم ترین ذمہ داریوں کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ ان کی علمی سرگرمیاں بھی ہمیشہ جاری رہیں، حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں جبکہ ان کی جان ہر وقت خطرے میں رہتی تھی اپنی آئندہ تصنیف "تاریخ سرکشی بجنور" کے لئے برابر مواد جمع کرتے رہے تھے۔

ابتدائے عمر سے وہ مطالعہ کے عادی تھے۔ ان کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت آرائی سے لطف اندوز ہونے کے لئے تھا، اور نہ کتاب دانی کی غرض سے؛ بلکہ ان کا مطلب صرف مصنف کے خیالات سے آگاہی حاصل کرنا ہوتا تھا۔ جو بات اپنے کام کی پاتے، اسپر پنسل سے نشان کرتے جاتے تھے؛ اور اگر کسی اخبار میں کوئی مضمون ان کی دلچسپی کا ہوتا، اس کا تراشہ اپنی اخباری فائل میں جو ہر وقت سامنے رکھی رہتی تھی،

چسپاں کردیتے تھے۔

ان کا بیان تھا کہ وہ تصنیف و تالیف یا مضمون آرائی میں جیسا میرا جی لگتا ہے، ویسا دنیا کے اور کسی کام میں نہیں لگتا۔" چنانچہ رنج میں، خوشی میں، صحت میں، بیماری میں، خلوت میں، جلوت میں، وہ اس مشغلہ سے کبھی نہیں اُکتاتے تھے۔ نہایت مضبوط القویٰ تھے؛ اس لئے انتہائی محنت شاقہ برداشت کرسکتے تھے۔ گرمی کی شدید دوپہر میں، جبکہ دنیا راحت و آرام کرتی ہے، یہ ہمیشہ تصنیف و تالیف میں منہمک پائے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ ناسازیٔ طبع میں بھی ان کو بہت کم صاحبِ فراش دیکھا گیا۔ بارہا ایسا اتفاق پیش آتا کہ علالت یا کسی دیگر وجہ سے شب کی نیند اُچاٹ ہوگئی؛ اور انہوں نے بستر پر کروٹیں بدلنے کی بجائے، قلم ہاتھ میں لے کر کسی تحریر کے لکھنے میں صبح کردی اگرچہ آخری ایام زندگی میں انہوں نے میز کرسی پر لکھنے کی عادت اختیار کرلی تھی؛ لیکن ابتدائے عمر سے وہ فرش پر بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کے خوگر تھے۔ چاروں طرف کتابیں پھیلی پڑی ہوتیں اور ان کے درمیان ان کی نشست رہتی تھی۔ جب کوئی اہم تصنیف و تالیف درپیش آتی تو رات کو بھی پلنگ پر سونا چھوڑ دیتے اور فرش پر شب بھر لکھتے رہتے تھے؛ اور تاکہ نیند نہ آنے پائے چائے کا دور برابر چلتا رہتا تھا۔ جب غنودگی کا غلبہ ہوتا، وہیں کسی کتاب کا تکیہ بنا کر ذرا آنکھ جھپکا لیتے، اور پھر تھوڑی دیر میں اُٹھ کر لکھنے بیٹھ جاتے تھے؛ غرض ان کی تمام رات یوں ہی کٹ جاتی تھی۔

مضمون لکھنے سے قبل غور و فکر کرنے کی عادت کم تھی۔ ان کی جیب میں ہر وقت ننھے ننھے سادہ پرچے اور پنسل پڑی رہتی تھی۔ جب کبھی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے کوئی نیا خیال آتا، فوراً لکھ لیتے؛ اور اس طرح ان کے خیالات کے حامل پرچے اکٹھے ہوتے رہتے تھے۔ جب مضمون لکھنے بیٹھتے تو ان کی تمام پڑیاں نکال کر میز پر اپنے سامنے رکھ لیتے؛ اور کھول کھول کر پڑھتے جاتے اور جو جس مقام کے لئے موزوں پاتے، وہاں درج کرتے جاتے تھے۔ اس طرح ترتیبِ مضامین کے بارے میں ان کو یہاں تک ملکہ حاصل ہوگیا تھا کہ ایک مرتبہ، انہوں نے اپنے لٹریری اسسٹنٹ، سید وحیدالدین سلیم،

سے ایک خاص موضوع پر بہت سے اقتباسات اس طرح جمع کرائے کہ کاپی کے اوراق میں صرف ایک صفحہ پر لکھے گئے تھے، دوسرا خالی تھا۔ جس مضمون کے لئے یہ اقتباسات اکٹھے کرائے گئے تھے، اس کو خود سرسید نے اس شان سے سپرد قلم کیا تھا کہ کہیں تو تحریر تھی اور کہیں درمیان میں جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ مولوی سلیم کا بیان ہے :-

"جب میں یہ تمام اقتباسات کی کاپی لیکر ان کے پاس پہونچا جو ڈیڑھ سو اوراق پر مشتمل تھی، سرسید نے ان اوراق کو قینچی سے تراشنا اور اپنے مضمون کی خالی جگہوں پر لئی سے چپکانا شروع کیا؛ یہاں تک کہ یہ تمام تراشے جنکا شمار بتانا مشکل ہے اپنی اپنی مناسب جگہ پر چسپاں کر دئے۔ اس طرح جب ان کے مضمون کا یہ مسودہ مکمل ہو چکا، اور میں نے اس کو اول سے آخر تک پڑھا، تو عبارت کے تسلسل، تراشوں کی صحیح ترتیب اور ربط الفاظ کو دیکھ کر میرے ہوش جاتے رہے۔"

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اثنائے تحریر میں جب کوئی مشکل مقام درپیش آجاتا، اور ان کو عمیق فکر و تردد کی ضرورت محسوس ہوتی، تو خواہ مجمع میں ہوتے یا تنہا، یکایک ان کا چہرہ سنجیدہ ہو جاتا؛ شگفتگی اور تبسم بالکل غائب ہو جاتے۔ لوگ چاروں طرف آپس میں باتیں کرتے ہوتے، مگر ان کو مطلق خبر نہ رہتی تھی؛ کبھی ایسے موقع پر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتے اور جب تک طبیعت راہ نہ دیتی، برابر اسی طرح مستغرق رہتے تھے۔ جب وہ عقدہ حل ہو جاتا، فوراً چہرہ پھر بحال ہو جاتا تھا۔ اس وقت اگر کوئی مخاطب صحیح پاس ہوتا تو بعض اوقات اپنا یہ سانحہ اس سے بیان کرتے، اور اگر دیگر حاضرین بھی اس کو سنکر پسند کرتے تو خوش ہوتے تھے؛ لیکن کوئی تائید نہ کرتا یا معترض ہوتا تو اس پر بحث کرتے یا خاموش ہو جاتے، مگر اپنی غلطی جلدی کبھی تسلیم نہ کرتے تھے۔ جب مضمون اتمام کو پہونچ جاتا، کوئی مناسب عنوان تجویز کرتے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پہلے سرخی قائم کر کے اس کے ذیل میں لکھتے۔ بار بار کاوش اور الفاظ کی قطع برید کرنا ان کا دستور نہ تھا۔ ہاں!

پروف پڑھتے وقت نظر ثانی ضرور کر لیتے تھے۔

سرسید کا خط کچھ اچھا نہ تھا، بایں ہمہ وہ کسی سے اپنا مسودہ صاف نہ کراتے، بلکہ مضمون پورا ہوتے ہی کمپوز کرنے کے لئے مطبع پریس کو بھیجدیتے تھے؛ اور جب تک وہ مضمون پرچہ میں چھپ نہ جاتا بڑے بے چین رہتے تھے۔ یہی حال ان کا تصنیف و تالیف کتب میں تھا؛ ادھر ایک پائنٹ ختم ہوتا، ادھر فوراً طباعت کے لئے روانہ کر دیا جاتا تھا۔

ان کی دور رس نگاہوں نے اردو کی وہ خامیاں اور ضرورتیں دیکھ لی تھیں، جو اس کی اشاعت و ترقی میں آگے چل کر دیگر ملکی زبانوں کے مقابلہ میں سنگِ راہ بننے والی تھیں؛ پر جب ان کو کوئی دوسرا آدمی کام کرنے والا نظر نہیں آتا تھا، تو خود ہی ان کاموں کے لئے کمربستہ ہو جاتے تھے؛ لیکن کیونکہ یک سر و ہزار سودا والا معاملہ تھا، لہٰذا وہ ان اضافی کاموں کو کبھی سرانجام کو نہ پہونچا سکے۔

اردو زبان میں اعلیٰ لغات کا فقدان اظہر من الشمس ہے۔ اس کمی کو رفع کرنے کے لئے سرسید نے ۱۸۶۸ء میں ایک اردو ڈکشنری بھی لکھنی شروع کی تھی، جس کا نمونہ سوسائٹی کے اخبار میں شائع ہوا تھا، اور اس پر یورپ کے مستشرقین کی عمدہ رائیں بھی چھپی تھیں۔ مگر دیگر اہم قومی کاموں کے ہجوم میں، وہ اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ اسی طرح وہ ادب اردو کی ایک ایسی فہرست یا تاریخ مرتب کرنی چاہتے تھے جس میں تمام کتابوں کا نام، مصنف کا حال، زمانۂ تصنیف، طرزِ بیان اور عبارت کے چند جستہ جستہ نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ ہو۔ اس کا تذکرہ ان کی سائنٹیفک سوسائٹی کے اس اڈریس میں جو ۹ مئی ۱۸۶۸ء کو سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر یو۔پی کو بمقام علیگڈھ پیش ہوا، کیا گیا تھا۔ مگر اس تالیف کو شروع کرنے تک کی نوبت نہیں آنے پائی۔ سرسید کی آخری تمنا یہ تھی، کہ ایک کتاب بطور تذکرۂ احباب کے لکھ جائیں، مگر افسوس کہ ان کی یہ تصنیف بھی شرمندۂ تحریر رہی۔

لکھنو کے قدیم طرزِ طباعت میں جو نقائص اور خامیاں ہیں اور جن سے اردو زبان کی نشر و اشاعت، اور فن صحافت کو جو نقصاناتِ عظیم پہونچے ہیں، سرسید نے ان کو بھی پوری طرح

محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے تہذیب الاخلاق کو لتھو کی بجائے ٹائپ پر اصولاً طبع کرایا، حالانکہ نہ تو ان کو ٹائپ میں کوئی کفایت مدنظر تھی، اور نہ وہ لوگ اس رسم الخط کو پڑھنے کے عادی تھے جن کے اندر ان کو اپنے مشن کی تبلیغ واشاعت منظور تھی۔

غرض کہ سر سید اپنی ذہنی ذکاوتوں کے اعتبار سے لقمانِ عصر، اور جسمانی صلابتوں کے لحاظ سے تہمتنِ وقت تھے۔ اور ان کی ہمہ گیر تگ وتاز برصغیر ہند کے جملہ مسائل مہمّہ کے ہر شعبہ اور قومی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھی۔ ان کی وہ مجاہدانہ سرفروشیاں جو ملتِ بیضا کے بقاؤ تحفظ کے لئے بروئے کار آئیں؛ ان کی وہ جدّوجہد جو وطن کی سیاسی اور آئینی برتری کے واسطے عمل میں آئی؛ ان کی وہ مخلصانہ قومی خدمات جو اصلاحِ معاشرت، اور تادیب اخلاقیات کی نذر ہوئیں؛ ان کی وہ زندۂ جاوید قربانیاں جو ملک وملت کی تعلیمی ترقی کی راہ میں پیش ہوئیں؛ ان کے وہ لازوال کارنامے جن سے زبان اردو گرانبار، اور ہمارے صحافت وادب مالامال ہیں؛ اور ان کے دیگر علمی اور عملی کارہائے نمایاں رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔

تمہیں کہتا ہے مردہ کون، تم زندوں کے زندہ ہو
تمہاری خوبیاں زندہ، تمہاری نیکیاں باقی۔

محمد عبد اللہ خاں خویشگی
فیروز منزل۔ خورجہ (یو۔پی۔)

مقالات سرسیّد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مضامین سرسیّد

تمہید

اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولیزیشن، یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے، تاکہ جس حقارت سے سولائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔

سولیزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا "تہذیب" ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت؛ تمدّن اور طریقۂ تمدن اور صرفِ اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہونچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا؛ جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے، اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔

یہ بات نہایت سچ ہے کہ کسی قوم کے مہذب ہونے میں اس قوم کے مذہب کو بھی بڑا دخل ہے۔ بے شک بعضے مذہب ایسے ہیں کہ وہ تہذیب قومی کے بڑے مانع ہیں۔ پس اب دیکھنا چاہیئے کہ کیا مسلمانی مذہب بھی ایسا ہی ہے۔ اس باب میں مختلف رائیں ہیں۔

ایک عیسائی متعصب مؤرخ نے ترکی کی سیر کے بعد اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ "جب تک ترک مذہب اسلام کو نہ چھوڑیں گے مہذب نہ ہوں گے کیونکہ مذہب اسلام انسان کی تہذیب کا مانع قوی ہے۔"

گورنمنٹ ترکی کو اس بات کی تحقیقات منظور ہوئی کہ درحقیقت مذہب اسلام مانع تہذیب ہے یا نہیں؛ اور چند علماء اور عقلاء اور وزراء کی کونسل اس امر کی نسبت رائے لکھنے کو مقرر کی جس کا افسر فواد پاشا تھا۔ اس کونسل نے جو رپورٹ لکھی اس کے دو فقروں کا ترجمہ اس مقام پر لکھا جاتا ہے:-

"اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی اور انسانیت اور تہذیب اور رحمدلی کو کمال کے درجہ پر پہونچانے والی ہیں۔ مگر ہم کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو، جو اگلے زمانہ میں مفید تھیں مگر حال کے زمانہ میں نہایت مضر ہوگئی ہیں، چھوڑنا چاہیئے۔"

اب دونوں رایوں میں سے کسی ایک رائے کو سچ کر کر دکھا دینا مسلمانوں کے اختیار میں ہے۔ اگر وہ اپنے عملی کاموں سے مثل اور دنیا کی مہذب قوموں کے اپنے تئیں بھی مہذب کر دکھائیں گے، تو فواد پاشا کی رائے کی تصدیق کریں گے، ورنہ از خود اس پہلی رائے کی تصدیق ہوگی۔

کیا یہ غیرت کی بات نہیں ہے کہ ہم غیر قوموں سے ایسی حقارت کے الفاظ اپنی نسبت اور اپنے روشن اور سچے مذہب کی نسبت سُنیں، اور اپنی تہذیب و تربیت اور شائستگی کی طرف متوجہ نہ ہوں؟

یہ جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ ہم فواد پاشا کی رائے کو، جو بڑے بڑے عقلاء اور علماء کے اتفاق سے لکھی گئی ہے، اختیار کریں اور بخوبی ہوشیار ہو کر نیک دلی اور غور سے اپنی حالت پر خیال کریں؛ اور جو رسوم و عادات اب ہم میں موجود ہیں اور جو مانع تہذیب ہیں ان کو دیکھیں کہ وہ کہاں سے آئیں، اور کیونکر ہم میں مل گئیں، اور یا کیونکر خود ہم میں پیدا ہوگئیں؛ اور اُن میں جون جون سی ناقص اور خراب اور مانع تہذیب ہوں اُن کو ترک

کریں، اور جو قابل اصلاح ہوں اُن کی اصلاح کریں؛ اور ہر ایک بات کو اپنے مذہبی مسائل کے ساتھ مقابلہ کرتے جائیں کہ وہ ترک یا اصلاح موافق شریعت بیضا کے ہے یا نہیں؛ تاکہ ہم اور ہمارا مذہب، دونوں، غیر قوموں کی حقارت اور ان کی نظروں کی ذلت سے بچے، کہ اس سے زیادہ ثواب کا کوئی کام اس زمانہ میں نہیں ہے۔

یہی ہمارا مطلب اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے؛ اور اسی مقصد کے لئے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچہ کے جہاں تک ہم سے ہو سکے اُن کے دین دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں؛ اور جو نقصان ہم میں ہیں، گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں اُن کو بخوبی دیکھتی ہیں، اُن سے ان کو مطلع کریں؛ اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں، ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلادیں۔ وَاللہ ولی التوفیق
السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ اللّٰہم آمین ثم آمین

مقاصد اجرائے تہذیب الاخلاق

انسان ایک ایسی ہستی ہے کہ آئندہ کی خبر اس کو نہیں ہو سکتی؛ مگر گذشتہ زمانہ کے تجربہ سے آئندہ زمانہ کی امید کو خیال کر سکتا ہے۔ پس ہم کو اس پرچہ کی بابت آئندہ زمانہ کی پیشین گوئی کرنے کے لئے پچھلے حالات اور واقعات پر نظر کرنی چاہیئے۔

جب ہم کچھ اوپر پچھلے ڈیڑھ سو برس کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہم پاتے ہیں کہ لندن میں بھی وہ زمانہ ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہندوستان میں ہے؛ اور وہاں بھی اس زمانہ میں اسی قسم کے پرچے جاری ہوئے تھے جن کے سبب تمام چیزوں میں تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی تھی۔ پس اول ہم ان پرچوں کا کچھ حال بیان کرتے ہیں اور پھر اس پرچہ "تہذیب الاخلاق" کو ان سے مقابلہ کریں گے؛ اور پھر آئندہ کی حالت ہندوستان کا اس پر قیاس کر کر اپنی قومی ترقی کی نسبت پیشین گوئی کریں گے۔

جبکہ یورپ میں باہم ملکی لڑائیوں کا زمانہ تھا، تو بہت سے بڑے بڑے شہروں میں اخبار کا چھپنا اور پھیلنا شروع ہو گیا تھا، اور خاص لندن میں بھی اخبار چھپنے لگا تھا مگر اپنی قوم کی روزمرہ زندگی اور ان کے مزاج اور عادت اور خصلت پر نکتہ چینی کرنے، اور اس میں سے برائیوں کے نکالنے، اور عمدہ اور نیک خصلتوں کو ترقی دینے کا کسی کو کسی ملک میں خیال نہ تھا۔ ہاں البتہ فرنچ لوگوں نے اس پر کچھ خیال کیا تھا؛ اور سولھویں صدی عیسوی میں مانٹین نے جو ایک فرنچ عالم تھے، خصلت و عادت پر کچھ مضمون چھپوائے تھے۔ اس کے بعد لابروئیر نے، جو ایک فرنچ عالم تھے، ایک کتاب چھپائی تھی، جس میں چودھویں لوئی بادشاہ فرانس کے دربار کی بناوٹوں کو نہایت سلیقہ کی طعنہ زنی سے بیان کیا تھا۔ لیکن کسی شخص کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ کوئی ایسا پرچہ یا

رسالہ نکلے جو چلد جلد یا ایک مناسب میعاد پر چھپا کرے، اور قومی برائیوں کو جتایا کرے، اور لوگوں کو قومی بھلائی کی ترقی پر رغبت دلاتا رہے۔ مگر خدا نے یہ کام لنڈن کے پیغمبروں اور سولیزیشن کے دیوتاؤں سر رچرڈ اسٹیل اور مسٹر ایڈیسن، کی قسمت میں لکھا تھا۔

سر رچرڈ اسٹیل نے سنہ ۱۷۰۹ع میں ایک پرچہ نکالا، جس کا نام ٹیٹلر تھا۔ اس کے اصلی اڈیٹر تو اسٹیل تھے مگر ایڈیسن بھی کبھی کبھی مدد دیتے تھے۔ یہ پرچہ ہفتہ میں تین ۳ دفعہ چھپتا تھا۔ پہلا پرچہ اس کا بارھویں ۱۲ اپریل سنہ ۱۷۰۹ع کو نکلا تھا۔

سر رچرڈ اسٹیل نے خود کہا ہے کہ ان کی غرض اس پرچہ کے نکالنے سے یہ تھی کہ انسان کی زندگی، جو جھوٹی بناوٹوں سے عیب دار ہوتی ہے، اُسے بے عیب کریں، اور مکاری اور جھوٹی شیخی کو مٹا دیں، اور بناوٹی پوشاک کو اتاریں، اور اپنی قوم کی پوشاک اور گفتگو اور برتاؤ میں عام سادہ پن پیدا کریں۔

اس پرچہ کے صرف دو سو اکہتر ۲۷۱ نمبر چھپے۔ چنانچہ اخیر پرچہ اس کا دوسری جنوری سنہ ۱۷۱۱ع کو چھپا اور پھر بند ہو گیا۔

اس کے بعد سر رچرڈ اسٹیل اور مسٹر ایڈیسن نے مل کر ایک اور پرچہ نکالا؛ اور اس کا نام "اسپیکٹیٹر" رکھا تھا۔ یہ پرچہ ہر روز چھپتا تھا، اور وہی دونوں اخیر تک اس میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ پہلا پرچہ اس کا یکم مارچ سنہ ۱۷۱۱ع کو چھپا تھا! اور صرف تین سو پینتیس ۳۳۵ نمبر اس کے چھپے تھے۔

یہ پرچہ اپنے زمانہ میں بے نظیر تھا؛ اور صرف ٹیٹلر ہی کو اس نے نہیں بھلا دیا تھا، بلکہ اس زمانہ میں جس قدر کتابیں اس قسم کی تصنیف ہوئی تھیں، ان سب پر فضیلت رکھتا تھا؛ عمدہ عمدہ اخلاق و آداب اس میں لکھے جاتے تھے، خویش و اقارب کے ساتھ سلوک کرنے کے عمدہ قاعدے اس میں بیان ہوتے تھے۔ اس بات کا کہ انسان اپنی اس قوت کو، جس کا نام شوق ہے، کس طرح دیکھ بھال اور سوچ بچار کر کس بات میں صرف کرے، نہایت عمدگی سے ذکر ہوتا تھا؛ اور ہر ایک مضمون نہایت خوبی اور بردباری اور عجیب و غریب مذاق سے بھرا ہوتا تھا۔ یہ پرچہ اس لئے بھی بے انتہا تعریف کا مستحق ہے کہ اس نے طرزِ تحریر

لوگوں کو سکھادی؛ اور لوگوں کی گفتگو کو جو بُرے کلمات اور بد محاورات اور ناپاک قسموں سے خراب ہو رہی تھی، درست کر دیا۔ ہر روز صبح کو یہ پرچہ نکلا کرتا تھا، اور حاضری کھانے کے وقت تک لوگوں کے پاس آجاتا تھا۔ اور حاضری ہی کی میز پر لوگ اس کو پڑھا کرتے تھے۔ ۱۷۱۳ء میں اس کا چھپنا موقوف ہو گیا۔

اس کے بعد سر رچرڈ اسٹیل نے مسٹر ایڈیسن کی مدد سے ایک اور پرچہ نکالا، جس کا نام "گارڈین" تھا۔ یہ پرچہ بھی ہر روز چھپتا تھا؛ اور صرف ایک سو پچپن نمبر اس کے نکلے تھے کہ بند ہو گیا۔

اس کے بعد اٹھارھویں صدی میں بہت سے پرچے اسی مقصد سے نکلے۔ مگر ان میں سے "رامبلر" اور "اڈوینچرز" اور "ایڈلر" اور "ورلڈ" اور "مرز" اور "لونجر" نے کچھ شہرت پائی؛ اور ان کے سوا اور کسی کو کچھ فروغ نہ ہوا۔

ان پرچوں کے جاری ہونے سے انگریزوں کے اخلاق اور عادات اور دینداری کو نہایت فائدہ پہونچا، اور ہر ایک کے دل پر ان کا اثر ہوا۔ جس زمانہ میں کہ پہلے پہل "ٹیٹلر" نکلا ہے، انگلستان کے لوگوں کی جہالت اور بد اخلاقی اور ناشائستگی نفرت کے قابل تھی۔ وضعدار لوگ، کیا مرد کیا عورت، تحصیل علم سے نفرت رکھتے تھے؛ اور علم پڑھنے کو خود فروشی و باد فروشی کہتے تھے، اور کمینوں کا کام سمجھتے تھے۔ علم جو اب عام لوگوں میں وہاں پھیلا ہوا ہے، شاذ و نادر کہیں کہیں پایا جاتا تھا۔ علم کا دعویٰ تو درکنار، جہالت کی شرم بھی کسی کو نہ تھی۔ عورت کا پڑھا لکھا ہونا، اس کی بدنامی کا باعث ہوتا تھا۔ اشرافوں کے جلسوں میں امورات سلطنت کی باتیں ہوتی تھیں، مگر عورتیں آپس میں ایک دوسری کی بدگوئی کیا کرتی تھیں۔ قسموں پر قسمیں کھانا، اور خلاف تہذیب کے باتیں کرنا، گویا ایک بڑی وضعداری گنی جاتی تھی۔ قمار بازی اور شراب خواری اور خانہ جنگی کی کچھ حد نہ تھی۔ چارلس دوم کے عہد میں جو خرابیاں تھیں، وہ شریف اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی گویا عادت تھی۔ بیلوں اور ریچھوں کو کتوں سے بھڑوانا، لوگوں کو انعام دیکر لڑوانا، اور خود ایسے تماشوں کو دیکھ کر خوش ہونا، گویا ہر ایک امیر کے شوق کی بات

تھی۔ ان تمام خرابیوں کی درستی میں اسٹیل اور ایڈیسن نہایت ہی سرگرم تھے؛ اور جس سرگرمی سے وہ اس میں مصروف ہوئے، ویسی ہی کامیابی بھی اس میں ان کی ہوئی۔

اسپیکٹیٹر میں ایک دفعہ لکھا تھا کہ:۔

"میں اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالوں گا، اور خوش طبعی کو اخلاق سے ملاؤں گا؛ تاکہ جہاں تک ممکن ہو، اس کے پڑھنے والے دونوں باتوں میں نصیحت پاویں؛ اور تاوقتیکہ لوگ ان تمام خرابیوں سے، جن میں اس زمانہ کے لوگ پڑے ہیں سنبھل نہ جاویں، ہر روز ان کو نصیحت کی باتیں یاد دلاتا رہوں گا؛ کیونکہ جو دل ایک دن بھی بے کار پڑا رہتا ہے، اس میں بے شمار عیب جڑ پکڑ جاتے ہیں، جس کے ریشے بہت ہی مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ سقراط کی نسبت ایسا کہا گیا ہے کہ اس نے فلسفہ کو آسمان سے اتارا اور انسانوں میں بسایا، مگر میں اپنی نسبت صرف اتنا ہی کہلانا چاہتا ہوں کہ میں نے فلسفہ کو مدرسوں اور مکتبوں کے کتب خانوں کی کوٹھریوں میں سے نکالا، اور جلسوں اور چار قہوہ پینے کی مجلسوں تک میں پھیلایا، اور ہر ایک دل میں بسایا۔"

اسٹیل اور ایڈیسن کی ایسی عمدہ تحریریں ہوتی تھیں کہ ان کا اثر صرف جلسوں کی تہذیب و زبان و گفتگو کی شائستگی ہی پر نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس زمانہ کے مصنفوں پر بھی اس کا نہایت عمدہ اثر ہوا تھا۔

ڈاکٹر ڈریک کا قول ہے کہ:۔

"عام لوگوں کو علم ادب کا شوق اسی وقت سے ہوا جب سے کہ ٹیٹلر چھپنا شروع ہوا، اور اسپیکٹیٹر اور گارڈین نے اس شوق کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔"

ان پرچوں کی تاثیر صرف لمحہ دو لمحہ کے لئے نہ تھی؛ بلکہ انگلستان میں ہر فرقہ کے لوگوں میں نہایت مضبوطی سے پھیل گئی تھی۔ ان پرچوں سے علم کو جو فائدہ ہوا وہ ہمیشہ یاد رہیگا۔ ان پرچوں نے اول اول نہایت خوش اسلوبی سے گزشتہ و حال کے زمانہ کے عمدہ و لائق مصنفوں

کو بتلایا، اور ان کی خوبیوں کی قدر کرنے کا شوق دلایا۔ مشہور ہے کہ ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" (فردوس ازدست رفتہ) کا، جو نہایت عمدہ اور بے نظیر کتاب ہے، انہی پرچوں کی بدولت فروغ ہوا۔ ان پرچوں کے مذاقِ تحریر اور خیالات کے رنگ ڈھنگ نے بُری تحریروں کے اسباب کو بتا دیا؛ اور جھوٹی عبارت آرائی اور لغو انشا پردازی کو جو کسبیوں کے بناؤ سنگار کی مانند تھی، اور رنڈیوں کے سے طعنے مہنے یا لونڈوں کی سی گالم گلوچ کو تحریروں میں سے بالکل دور کر دیا۔ اچھی اور بُری تحریروں میں تمیز کرنا اور سنجیدہ و متین نکتہ چینی اور تحقیقات کا شوق پیدا کیا۔ ذہانت اور متانت دونوں کو ترقی دی اور تحریر میں مناسبت اور تہذیب کا خیال لوگوں کے دل میں بٹھا دیا۔ ان باتوں سے ان پرچوں کے پڑھنے والے لئیق اور عالم مصنفوں کی تصنیفوں سے حظ اٹھانے لگے، اور تمیز کے ساتھ ان کی قدر کرنے لگے۔

ایڈیسن کی تحریروں سے بالتخصیص، طرزِ عبارت بہ نسبت سابق کے بہت زیادہ صاف و شُستہ و سلیس اور نہایت دلچسپ ہو گئی؛ اور درحقیقت ایڈیسن کی تحریر سے انگریزی زبان کے علمِ انشا میں ایک انقلابِ عظیم واقع ہو گیا۔ باوجودیکہ زمانہ حال میں تحریروں کے عیب و ہنر کو لوگ خوب جانچتے ہیں، اس پر بھی ایڈیسن کی تحریر پر بجز تعریف کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

علاوہ ان باتوں کے اسپیکٹیٹر کے پرچوں میں انسان کے خیالات کے مخرج، اور ان خیالات سے جو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں، ان کی تفریق نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے بتلائی گئی ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ ہوا کہ شاعروں کے خیالات، اور ان کے اشعار کی خیال بندی نہایت عمدہ اور درست ہو گئی۔ لغو اور بے سر و پا مضمون اشعار میں سے خارج ہو گئے اور اُن کی بجائے پُر تاثیر مضمونوں نے جگہ پائی۔ ہر ایک کو لئیق اور قابل مُصنفوں کی تحریروں کے جانچنے، اور ان کی قدر کرنے، اور اُن سے مزا اٹھانے کی لیاقت پیدا ہو گئی؛ اور رفتہ رفتہ تمام قوم عالم اور محقّق کے لقب کی مستحق ٹھہر گئی۔ اسپیکٹیٹر کے پڑھنے والوں کو علمِ انشا کی وہ خوبی جو ایڈیسن کے ذہن میں تھی، معلوم ہوئی۔ سب لوگ اس کی تحریر کے لطف و صفائی کی تعریف کرنے لگے اور

سب لوگوں کو ایسے شخصوں کی تحریروں کے جانچنے کی، جو علم انشار میں ناموری کے خواہاں ہوتے تھے، لیاقت حاصل ہو گئی۔

ان پرچوں سے صرف علم ادب اور علم انشار ہی میں ترقی نہیں ہوئی، بلکہ اخلاق اور عادت اور خصلت کو بھی بہت کچھ ترقی ہوئی۔ نیکی کے برتاؤ میں جو خود انسان کی اپنی ذات سے اور اپنے خویش اور اقربا، دوست آشنا، یگانہ و بیگانہ سے علاقہ رکھتی ہے، نہایت اعلیٰ درجہ کی تہذیب حاصل ہوئی؛ اور خود تہذیب و شائستگی کو ایسی عمدہ صیقل ہوئی، جس کی آج تک کوئی نظیر نہیں۔ ملکی امورات کی بحث ومباحثہ میں جو تیزی و عداوت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے، وہ تھوڑے سے عرصہ میں نہایت کم ہو گئی؛ اور جو لیاقت کہ صرف بحث و مباحثہ میں صرف ہوتی تھی، وہ خوشگوار پانی کی مانند، خوبصورت نہروں میں بہنے لگی؛ جنہوں نے اخلاق اور علم و ادب کو سیراب کر کر لوگوں کے دلوں کے برے اور خراب جوش کو پاک وصاف کر دیا۔

ہندوستان میں ہماری قوم کا حال اس زمانہ سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی۔ مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہلِ مرکب میں مبتلا ہے۔ علوم، جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے، اور جس کے تکبر اور غرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے، دین و دنیا دونوں میں بکار آمد نہیں۔ غلط اور بے اصل باتوں کی پیروی کرنا؛ اور بے اصل اور اپنے آپ پیدا کئے ہوئے خیالات کو امور واقعی اور حقیقی سمجھ لینا؛ اور پھر اُن پر فرضی بحثیں بڑھاتے جانا؛ اور دوسری بات کو، گو وہ کیسی ہی سچ اور واقعی کیوں نہ ہو، نہ ماننا؛ لفظی بحثوں پر علم و فضیلت کا دارومدار ہونا؛ اُن کا نتیجہ ہے۔

علم ادب و انشار کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے، اور ہموزن اور قریب التلفظ کلموں کے تک ملانے، اور دور از کار خیالات بیان کرنے، اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط و کتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں بھی یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خدا ہی نخواستہ ایسا نہ ہو گا جس میں جھوٹ

اور وہ بات جو درحقیقت دل میں نہیں ہے، مندرج نہ ہو۔ خطوطِ رسمیہ کے پڑھنے سے ہرگز تمیز نہیں ہو سکتی کہ حقیقت میں اس خط کا لکھنے والا ایسا ہی ہمارا دوست ہے، جیسا کہ اس میں لکھا ہے؛ یا یہ صرف معمولی مضمون ہے، جس کے لکھنے کا عموماً رواج پڑ گیا ہے۔ پس ایسی طرزِ تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے اور ہم کو جھوٹی اور بناوٹی تحریر کا عادی کر دیا ہے۔

فنِ شاعری، جیسا ہمارے زمانہ میں خراب اور ناقص ہے، اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے، وہ بھی نیک جذباتِ انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو ضد حقیقی تہذیب و اخلاق کے ہیں۔

خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب اور ناقص پڑ گیا ہے؛ جس سے، ایک تعجب تو طبیعت پر آتا ہے، مگر اس کا اثر مطلق دل میں یا خصلت میں، یا اُس انسانی جذبہ میں جس سے وہ متعلق ہے، کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ فطرتی جذبات، اور ان کی قدرتی تحریک، اور اُن کی جبلی حالت کا کسی پیرایہ، یا کنایہ، یا اشارہ، یا تشبیہ و استعارہ، میں بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔ ملٹن کی "پیراڈائز لوسٹ" کچھ چیز نہیں ہے، بجز اس کے کہ انسان کی طبیعت کی حالت کی تصویر ہے، جس کا ہر ہر شعر دل میں گھر کرتا جاتا ہے۔ شیکسپیئر میں کچھ نہیں ہے، بجز اس کے کہ اس نے انسان کا نیچر یعنی قدرتی بناوٹِ طبیعت کو بیان کیا ہے، جو نہایت موثر انسان کی طبیعت پر ہے۔

علمِ دین تو وہ خراب ہوا ہے، جیسا خراب ہونے کا حق ہے! اس معصوم، سیدھے سادے، سچے، اور نیک طبیعت والے پیغمبر نے جو خدا تعالیٰ کے احکام بہت سیدھاوٹ و صفائی و بے تکلفی سے جاہل، اَن پڑھ، بادیہ نشین عرب کی قوم کو پہونچائے تھے، اس میں وہ نکتہ چینیاں، باریکیاں گھسیڑی گئیں، اور وہ مسائل فلسفیہ اور دلائل منطقیہ ملائے گئے، کہ اس میں اُس صفائی اور سیدھاوٹ اور سادہ پن کا مطلق

اثر نہیں رہا۔ بمجبوری لوگوں کو اصلی احکام کو، جو قرآن و معتمد حدیثوں میں تھے چھوڑنا پڑا اور زید و عمرو کے بنائے ہوئے اصول کی پیروی کرنی پڑی۔

علم مجلس، اور اخلاق، اور برتاؤ دوستی کا، ایک ایسے طریقہ پر پڑ گیا ہے، جو نفاق سے بھی بدتر ہے۔ اخلاق صرف منھ پر میٹھی میٹھی باتیں بنانے اور اوپری تپاک جتانے کا نام ہے۔ آپس میں دو شخص ایسی محبت اور دلسوزی کی باتیں کرتے ہیں کہ دیکھنے سننے والے ان دونوں کو یک مغز و دو پوست سمجھتے ہیں؛ مگر جب ان کے دل کو دیکھو، تو یک پوست و دو مغز سے بے میل ہیں۔ صرف مکاری اور ظاہرداری کا نام اخلاق رہ گیا ہے! اور بے ایمانی اور دغابازی کا نام، ہوشیاری۔

گفتگو پر خیال کرو، تو عجب ہی لطف دکھائی دیتا ہے، اگرچہ اکثر لفظ تو نہیں ہوتے، مگر ہزاروں اکثر مضمون زبان سے نکلتے ہیں۔ نہایت مہذب، اور معقول، وثقہ، نیک و دیندار آدمی بھی اپنی گفتگو میں تہذیب و شائستگی کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ دوست کی بات کو جھوٹ کہہ دینا؛ دوست کی نسبت جھوٹ کی نسبت کر دینا! یہ تو ادنیٰ سے ادنیٰ روزمرہ کی بات ہے۔ ایک نہایت نیک آدمی اپنے بڑے مقدس دوست کے بیٹے سے عین حالتِ تپاک اور خوش اخلاقی اور جوشِ محبت کی باتوں میں کہہ رہا تھا کہ :—

"تمہارے باپ تو جھوٹوں کے بادشاہ ہیں، وہ تو دن رات سینکڑوں غپیں ہانک دیتے ہیں، ان کی بات پر کیا اعتبار ہے۔"

پس افسوس ہے، ہم کو خود اپنے پر کہ ہمارے ایسے دوست ہیں! اگر اشراف جو ان دوستوں کی محفل میں جاؤ، تو سنو کہ وہ آپس میں کیسی گالم گلوچ اور فحش باتیں ایک دوسرے کی نسبت کرتے ہیں۔ ایک نہایت معزز شریف خاندانی آدمی نے، جو صاحب تصنیف ہیں اور اردو کے علم ادب میں مشہور ہیں، تیس ۳۰ منٹ مجھ سے دوستانہ گفتگو کی، اور میں نے خوب خیال کر کر گنا کہ اُن کے مُنہ سے چھتیس ۳۶ لفظ گالیوں کے نکلے، جس میں سے کچھ اپنی نسبت تھیں اور کچھ اس کتاب اور اس کے مصنف کی

نسبت جس کا ذکر تھا، اور کچھ اِدھر اُدھر بیٹھنے والوں اور سُننے والوں کی نسبت
امیروں کا حال دیکھو تو اُن کو دن رات بٹیر لڑانے اور مرغ لڑانے اور کبوتر
اُڑانے، اور اسی طرح تمام لغویات میں اپنی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کچھ کام
دھندا نہیں!
نیکی پر متوجہ ہوتے ہیں، تو اُس کو اتنا گھونٹتے ہیں کہ بدمزہ ہو جاتی ہے؛
اور جب بدی پر اترتے ہیں، پھر تو شیطان کے بھی کان کترتے ہیں!

غرض جو کچھ اس زمانہ میں فرنگستان میں تھا، وہی کچھ، بلکہ اس سے بھی
زیادہ اب ہندوستان میں موجود ہے؛ اور بلاشبہ ایک ٹیٹلر اور ۲ اسپیکٹیٹر کی یہاں
ضرورت تھی. سو خدا کا شکر ہے کہ یہ پرچہ انہی کا قائم مقام مسلمانوں کے لئے ہندستان
میں جاری ہوا ہے. مگر افسوس! کہ یہاں کوئی ۱ اسٹیل اور ۲ ایڈیسن نہیں ہے.

۱ اسٹیل اور ۲ ایڈیسن کو اپنے زمانہ میں ایک بات کی بہت آسانی تھی، کہ اُن کی
تحریر اور اُن کے خیالات جہاں تک کہ تھے تہذیب و شائستگی و حسنِ معاشرت پر محدود تھے.
مذہبی مسائل کی چھیڑ چھاڑ ان میں کچھ نہیں تھی. ہم بھی مذہبی خیالات سے بہت بچنا
چاہتے ہیں، مگر ہمارے ہاں تمام رسمیں اور عادتیں مذہب سے ایسی مل گئی ہیں کہ بغیر
مذہبی بحث کئے، ایک قدم بھی تہذیب و شائستگی کی راہ میں نہیں چل سکتے. جس
بات کو کہو کہ "چھوڑو!" فوراً جواب ملے گا کہ "مذہباً ثواب ہے!" اور جس بات کو
کہو کہ "سیکھو!" اسی وقت کوئی بولے گا کہ "مذہباً منع ہے." پس ہم مجبور ہیں کہ
تہذیب و شائستگی اور حسنِ معاشرت سکھانے میں ہم کو مذہبی بحث کرنی پڑتی ہے.

مذہبی بحث کا ایک عجیب سلسلہ ہے، کہ ایک چھوٹی سی بات پر بحث کرنے سے
بڑے بڑے مسائل اور اصولِ مذہب بحث میں آجاتے ہیں؛ اور اس لئے لاچار کبھی ہم
کو فقہ سے بحث کرنی پڑتی ہے، اور کبھی اصولِ فقہ سے؛ اور کبھی حدیث سے بحث کرنی
پڑتی ہے، اور کبھی اصولِ حدیث سے؛ اور کبھی تفسیر سے بحث کرنی پڑتی ہے، اور کبھی
اصولِ تفسیر سے. پس ہندوستان میں صرف ۱ اسٹیل اور ۲ ایڈیسن ہی کی ضرورت

نہیں ہے ، بلکہ مقدس لو تھکر کی بھی بہت بڑی حاجت ہے۔

اسٹیل اور ایڈیسن کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کے زمانہ کے لوگ ان کی تحریروں کو پڑھتے تھے ، اور قدر کرتے تھے ؛ اور ہماری یہ بدنصیبی ہے کہ ہماری تحریروں کو مذہب کے برخلاف کہا جاتا ہے اور اُن کا پڑھنا باعثِ عذاب سمجھا جاتا ہے۔ اسٹیل اور ایڈیسن اپنے ہر پرچہ کے مشہور ہونے کے بعد ، "واہ ! واہ !!" کی آواز سُننے سے اپنی محنت ومشقّت ، فکر وخیال کی کلفت کو دور کرتے ہوں گے ؛ اور ہم ، اپنی تحریریں کے مشہور ہونے کے بعد ، بجز لعنت وملامت سُننے کے اور کسی بات کی توقع نہیں رکھتے ہیں۔ اسٹیل اور ایڈیسن جن لوگوں کی بھلائی کرتے تھے ، اُن سے بھلا سُنتے تھے ؛ ہم جن کی بھلائی چاہتے ہیں ، اُن سے بُرائی پاتے ہیں ؛ جن کے حق میں بھلا کہتے ہیں ، اُن سے بُرا سُنتے ہیں۔ اسٹیل اور ایڈیسن کو ہزاروں دل اپنی طرف کر لینے کچھ مشکل نہ تھے ؛ اور ہم کو ایک دل بھی اپنی طرف کرنا مشکل ہے۔ اسٹیل اور ایڈیسن کو بنے بنائے دل اپنی طرف جُھکانے تھے ؛ ہم کو یہ مشکل ہے کہ دل بھی ہم ہی کو بنانا ہے ، اور ہم ہی کو اُس کا جُھکانا ہے۔

لوگ ہمارے ان خیالات کو جنون اور مالیخولیا بتاتے ہیں۔ مگر "دیوانہ بکار خود ہوشیار" ہم خوب سمجھتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اس لیئے ہم آئندہ کی بہتری کی خدا سے توقع رکھتے ہیں ، اور اچھے زمانہ آنے والوں کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ گو اُن کے آنے کا زمانہ ہم نہیں جانتے ، مگر یقین کرتے ہیں کہ ضرور بے شک آنے والے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اس مسکین پرچہ کے ذریعہ سے ہندوستان میں وہ کچھ کرینگے جو اسٹیل اور ایڈیسن نے انگلستان میں کیا ؛ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جہانتک ہم سے ہوسکتا ہے ، ہم اپنا فرض پورا کریں گے !!

تکمیل

ایک فارسی مثل مشہور ہے کہ "ہر کمالے را زوالے"؛ مگر اس کے معنی، اور اس کی وجہ بخوبی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایک اور بڑے حکیم نے اسی مطلب کو نہایت عمدگی اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس کا یہ قول ہے کہ "ہم کو اپنے تئیں درجۂ کمال پر پہونچا ہوا سمجھنا ہی زوال کی نشانی ہے۔" اور بلاشبہہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے، جب کوئی شخص یا قوم کسی بات میں اپنے تئیں کامل سمجھ لیتی ہے، تو وہ سعی اور کوشش اور زیادہ تحقیقات اور نئی نئی باتوں کی ایجاد سے باز رہتی ہے؛ اور رفتہ رفتہ، اس چیز میں جس کو کامل سمجھا تھا، زوال آجاتا ہے۔

کاملِ مطلق بجز ذاتِ باری کے اور کوئی نہیں ہے؛ پس جو کچھ خدا نے کیا یا کہا وہ تو اپنی قسم میں کامل ہے؛ اور اس کے سوا، اور کوئی چیز جو انسان نے کی ہو یا کہی ہو، کامل نہیں ہے، کیونکہ قابلِ سہو و خطا ہونا انسان کی شان سے ہے۔ اگر یہ بات اس طرح پر نہ ہوتی، تو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام پہ وحی نازل ہونے کی ضرورت نہ رہتی۔ پس ان تمام چیزوں کو جو انسان سے ایجاد ہوئی ہیں یا نتائجِ عقلِ انسانی ہیں، اُن کو کامل سمجھ لینا ٹھیٹ ہماری غلطی، اور ہمارے تنزل و ادبار کی ٹھیک نشانی ہے۔ کسی شخص یا کسی قوم کو کسی چیز میں کامل سمجھ لینا بہت سی خرابیوں اور نقصانوں کا باعث ہوتا ہے: جو چیز کہ حقیقت میں کامل نہیں ہے ہم اس کو غلطی سے کامل سمجھ لیتے ہیں؛ ہم میں ایک استغنا پیدا ہوتا ہے، جس سے، سوائے اس کے اور کسی بات یا تحقیقات کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور اس بات کے فائدے سے محروم رہتے ہیں؛ لوگوں کے اعتراضوں کے سننے کو گوارا نہیں کرتے، اور اس سبب سے اپنی غلطیوں پر متنبہ نہیں

ہوتے، اور جہل مرکب میں پھنسے رہتے ہیں؛ کوشش سے جو ایک ترقی کا فائدہ ہے اس کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں۔ خدا نے جو ہم کو عقل دی ہے، اور جس کا یہ فائدہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم اس کو کام میں لاویں، اوروں پر بھروسہ کر کر اس کو بے کار کر دیتے ہیں۔

ایسا کرنے میں ہم صرف اپنا ہی نقصان نہیں کرتے بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی بہت بڑا نقصان پہونچاتے ہیں، کیونکہ ہماری اور ہماری آئندہ نسلوں کی عقل اور جودتِ طبع، اور تیزیِ ذہن، اور طاقتِ انتقالِ ذہنی، اور قوتِ ایجاد سب مٹ جاتی ہے؛ اور صرف اوروں کی ٹٹکاری پر ہماری چال رہ جاتی ہے؛ اور ہم ٹھیک اس مثل کے مصداق ہو جاتے ہیں "چارپائے بروکتابے چند۔"

ہم مسلمانوں نے اپنے میں اس نقص کو نہایت درجہ پر پہونچا دیا ہے؛ اور جو نقصان دینی اور دُنیوی اس سے ہم نے اُٹھائے ہیں، اُن کی کچھ انتہا نہیں۔ بھلا، دینی باتوں کو اس وقت رہنے دو؛ اور صرف اس بات پر غور کرو، کہ دُنیوی علوم، اور دُنیوی کاروبار، اور دُنیا کی باہمی معاشرت اور مجالست، اور رسوم و عادات اور طریقہ تعلیم اور تربیت، اور ترقیِ علم مجلس میں کیوں نہ ہم کوشش کریں؛ اور جس طرح اور قوموں نے ان باتوں میں ترقی کی ہے، ہم بھی اسی طرح کیوں نہ ترقی کریں؟

ارسطو کچھ ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا، جو ہم اس کے علوم، اور اس کے فلسفہ، اور اس کے الٰہیات کو ناقابلِ غلطی کے سمجھیں۔ بوعلی کچھ صاحبِ وحی نہ تھا کہ اس کی طب کے سوا اور کسی کو نہ مانیں۔ جو علومِ دُنیوی ہم مدت دراز سے پڑھتے آتے تھے، اور جو اپنے زمانہ میں ایسے تھے کہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، انہی پر پابند رہنے کے لئے ہم پر کوئی خدا کا حکم نہیں آیا تھا۔ پھر کیوں ہم اپنی آنکھ نہ کھولیں؟ اور نئے نئے علوم، اور نئی نئی چیزیں، جو خدا تعالیٰ کی عجائبات قدرت کے نمونے ہیں، اور جو روز بروز انسان پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں، اُن کو کیوں نہ دیکھیں؟ یہ جو کچھ ہم نے کہا، یہ صرف خیالی ہی باتیں نہیں ہیں، بلکہ اس،

وقت دنیا میں ہمارے سامنے اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کی قومیں ہیں؛ جن میں سے ایک نے اپنے باپ داوا کو درجۂ کمال پر پہونچا ہوا، اور نا قابل سہو و خطا سمجھ کر ان کے علوم و فنون اور طریق معاشرت کو کامل سمجھا، اور اسی کی پیروی پر جمے رہے اور اس کی ترقی اور بہتری پر اور نئی چیزوں کے اخذ و ایجاد پر کچھ کوشش نہیں کی؛ اور دوسری نے کسی کو کامل نہیں سمجھا، اور ہمیشہ ترقی میں، اور نئے نئے علوم و فنون و طریقۂ معاشرت کے ایجاد میں کوشش کرتی رہی۔ اب دیکھ لو! ان دونوں میں کیا فرق ہے، اور کون تنزل اور کون ترقی کی حالت میں ہے۔

ہندو اور مسلمان وہ قومیں ہیں جو پچھلی لکیر کو کامل سمجھ کر اسی کو پیٹتے آتے ہیں؛ انگریز، فرنچ اور جرمن ایسی قومیں ہیں جو ہمیشہ ترقی کی کوشش میں ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ دونوں پہلی قومیں علم و ہنر و تربیت و شائستگی میں اپنے دور میں اپنی ہمعصر قوموں سے مقدم اور اعلیٰ تھیں؛ اور شاید مسلمانوں کو یہ بھی عزت تھی کہ وہ یورپ کی بعض قوموں کے لئے بمنزلہ استاد کے گنے جاتے تھے۔ مگر اسی عیب نے جو ان قوموں میں تھا اور اب بھی ہے؛ اور اسی خوبی نے جو پچھلی قوموں میں تھی اور اب بھی ہے، ٹھیک ٹھیک معاملہ بالعکس کر دیا ہے۔ اب یورپ کی قومیں ایشیائی قوموں سے علم و ہنر، تربیت و شائستگی میں اعلیٰ ہیں۔ پس میرا مطلب صرف یہی ہے کہ ہماری قوم کو بھی چاہیئے کہ اپنے دماغ کو ان بیہودہ اور لغو خیالات سے، جنھوں نے ان کی عقل اور سمجھ کو بالکل خراب کر رکھا ہے، اور ان کی تمام خوبیوں کو خیالات فاسد کے کیچڑ میں لتھڑ پتھڑ کر دیا ہے، خالی کریں، اور علوم اور فنون اور تہذیب و شائستگی میں ترقی کرنے کی پوری کوشش کریں، اور انصاف سے دیکھیں کہ ان کی تہذیب اور شائستگی میں نقصان ہونے کے سبب سے ان کی قوم کی کیسی بدنامی ہے؛ اور ان عمدہ خیالات اور قواعد کو، جو خدا تعالیٰ نے مذہب اسلام کی بدولت ان کو دئے تھے، بُری طرح استعمال میں لانے، اور اُن کو بدصورت کر دینے سے غیر قومیں اسلام

کو ہماری نالائقی کی بدولت کیسی حقارت اور نفرت سے دیکھتی ہیں؛ کیسے خندہ زن اشارات اور کنایات اس پر کرتی ہیں؛ اور ہماری شامتِ اعمال کو نتیجہ مذہب اسلام ٹھہراتی ہیں۔ ان کا ایسا کہنا اور خیال کرنا کچھ بے جا نہیں ہے۔ اسلام کوئی مٹی کا پتلا نہیں ہے جس کو کوئی دیکھ سکے۔ مسلمانوں کی حالت اور ان کے چال چلن سے اسلام کی صورت دکھائی دیتی ہے، سو انہوں نے اس کو ایسا بد صورت بنایا ہے کہ جو کوئی نفرت کرے، کچھ تعجب نہیں۔ بس، اب میری یہ خواہش ہے کہ مسلمان اپنے اخلاق اور تہذیب و شائستگی کی درستی میں پوری کوشش کریں، اور اپنے حال اور چال چلن کو درست اور عمدہ کریں، اسلام کی جو اصلی صورت ہے وہ دنیا کو دکھاویں!

تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن یا تہذیب کیا چیز ہے؟ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے؟ یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے؟ یا یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مفہوم، اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے، قانونِ قدرت میں پایا جاتا ہے؟ اس امر کے تصفیہ کے لئے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہیئے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطرتی چیز ہے، تو وحشیوں میں، شہریوں میں، سب میں اس کا نشان ملے گا۔ گو اس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں، الّا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطرتی بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے، اور کسی چیز کو بُرا۔ اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اس بُری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرے، جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے جو انسانوں کو ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اس تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے! اور کچھ شبہہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہشِ تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اصول ٹھہرے، اچھا یا بُرا! اور بُرے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہری۔ مگر

اچھا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی اور خُلقی، مُلکی اور تمدّنی، ایسے ہوتے ہیں، جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہرانے میں، یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں، اختلاف پڑ جاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے، دوسری قوم اسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے؛ اشخاص میں نہیں ہوتا، یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔

جبکہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے، تو اکثر ان کی ضرورتیں، اور ان کی حاجتیں، ان کی غذائیں، اور ان کی پوشاکیں، ان کی معلومات، اور ان کے خیالات، ان کی مسرّت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں، سب یکساں ہوتی ہیں؛ اور اسی لیے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب یکساں پیدا ہوتے ہیں؛ اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک ہی ہوتی ہے؛ اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔ مگر، جبکہ مختلف گروہ ہیں مختلف مقامات میں بستے ہیں، تو ان کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں؛ اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ضرور کوئی چیز ایسی بھی ہوگی جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے۔

مُلکی حالتیں، جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں، نہ فکر اور خیال اور دماغ سے، ان کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں، بلکہ صرف انسان کے خیال کو اس سے تعلق ہے، جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھہراتا ہے؛ اور جس باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے، اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے، جو سولزیشن کہلاتا ہے۔ پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں، جن کے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

اچھے اور بُرے کی جگہ میں اور لفظ استعمال کروں گا، یعنی پسند اور ناپسند۔ انگریزی میں ایک لفظ "ٹیسٹ" ہے، جو نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی اس قسم کے لفظ ہیں جیسا کہ "مزا یا مذاق"؛ مگر وہ استعمال میں

ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ اُن سے وہ عام اور وسیع معنیٰ خیال میں نہیں آتے؛ اس واسطے میں اس لفظ کا ترجمہ پسند کرتا ہوں۔ پس پسند کا صحیح ہونا، جو خیال کے صحیح ہونے کی فرع ہے، بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے تصفیہ کا ہے۔

خیال کی دُرستی اور پسند کی صحت کثرت معلومات پر، اور علم طبیعیات سے بخوبی ماہر ہونے پر، منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے؛ اور اس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آوے، کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی وہ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مؤدب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب، یا یوں کہو کہ بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا، دنیا کی تمام چیزوں سے، اخلاقی ہوں یا مادّی، یکساں تعلق رکھتا ہے، اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہُنر اور اس کو ترقی دینا، تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر، یاقوت و الماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے؛ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہونچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے چاندی، مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں؛ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو تیلیوں پر سے چھلے ہوئے سُنہری پوست، اور زمرد کے سے رنگ کی باریک، اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی دُرستی کا خیال ہے؛ ناتربیت یافتہ قومیں بھی اس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات، نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں، اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں؛ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے، اور ان کے رہنے کے گھونپے، درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈ، زمین میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی، تہذیب سے خالی نہیں۔

معاشرت کی چیزیں، تمدن کے قاعدے، عیش و عشرت کی مجلسیں، خاطر اور مدارات کے کام، اور اخلاق و محبت کی علامتیں، دونوں میں پائی جاتی ہیں۔

علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں؛ بلکہ بعض چیزیں ان میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں، مثلاً شاعری، جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے، ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے، اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔

موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقّی پائی ہے، مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ ان کی ادا اور آواز کی پھرت، اُس کا گھٹاؤ اور اس کا بڑھاؤ، اس کا ٹھہراؤ اور اس کی اُپج، ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک، زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں؛ وہ لے اور تال، راگ و راگنی کو نہیں جانتے، مگر دل کی لہر، ان کی لے، اور دل کی پھڑک، ان کا تال ہے؛ اُن کا غول باندھ کر کھڑا ہونا، طبعی حرکت کے ساتھ اُچھلنا، دل کی بیتابی سے جُھکنا، اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا، گو نزاکت اور فنِ خُنیاگری سے خالی ہو، مگر قدرتی جذبوں کی موزوں تصویر ہے۔

دلی جذبوں کو روکنا اور ان کو عمدہ حالت میں رکھنا، تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس، جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں، اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں۔ جس چیز میں کہ ترقی، یعنی بُرائی سے اچھائی کی طرف رجوع، یا ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ کی طرف، تحریک ہو سکتی ہے، اُسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔

پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا؛ وقت کو عزیز سمجھنا؛ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈھنا

اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا ؛ اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریق تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہونچانا ؛ اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہے ؟ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی ، اور اصلی تمکین ، اور حقیقی وقار ، اور خود اپنی عزت کی عزت۔ اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے ، جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

اس تہذیب کے حاصل کرنے کے ، بقول مسٹر ایچ۔ ٹی۔ بکل صاحب ، چار اصول ہیں :-

اوّل ، جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں ، اور جن کا سبب ہم کو معلوم نہیں ہوتا ، ان کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت کرنا ، اور ان کے علوم کو پھیلانا ؛ پس جسقدر کامیابی اس میں ہوگی اسی قدر انسان کی ترقی ہوگی۔

دوم ، اس تحقیقات سے پہلے تجسس کا خیال پیدا ہونا چاہیئے ، جس سے ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے ، اور بعد کو تحقیقات سے اس کی استعانت ہوتی ہے۔

سوم ، جو باتیں اس طرح پر دریافت ہوتی ہیں ، وہ عقلی باتوں کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں ؛ اور اخلاق کی باتوں کو کسی قدر کم ؛ مگر اخلاق کی باتیں بہ نسبت عقل کی باتوں کے زیادہ مستقل ہیں ، اور ان میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے۔

چہارم ، اس تحریک کا بڑا دشمن ، جو درحقیقت سولزیشن کا بھی سخت دشمن ہے ، یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے امورات کی نگرانی ہر طرح پر سلطنت اور مذہب سے نہ ہو ، تب تک انسان کے گروہ کی ترقی نہیں ہوسکتی ؛ یعنی سلطنت رعایا کو یہ سکھلا دے کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے ، اور مذہب یہ سکھلا دے کہ کس بات پر یقین کرنا چاہیئے۔

پچھلی بات میں مسٹر بکل سے مجکو کسی قدر اختلاف ہے۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ لوگوں کا یہ خیال کہ گورنمنٹ ہم کو بتادے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے ، انسان کی

ترقی اور تہذیب کا نہایت قوی مانع ہے ؛ اور جسقدر کہ ہندوستان میں ، بلکہ تمام ایشیا میں ناشائستگی اور ناتہذیبی ہے ، اس کا بڑا سبب یہی خیال ہے ؛ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی خیال نے غارت اور برباد کیا ہے ۔ پس جب تک یہ خیال نہ جاوے گا ، اور یہ خیال نہ آوے گا کہ ہم خود سوچیں کہ ہم کو اپنے لئے کیا کرنا چاہیئے ، اس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کو نہ دولت ہوگی نہ حشمت ؛ نہ عزّت ہوگی نہ منزلت ؛ اور نہ تہذیب ہوگی اور نہ شائستگی ۔

دوسرا جملہ جو مذہب سے متعلق ہے کسی قدر صحیح ہے اور کسی قدر غلط ؛ یعنی غلط مذہب بلاشبہ تہذیب کا بڑا مانع ہے ۔ اور اگر سچے مذہب میں غلط خیالات اور بے جا تعصبات اور مسائل اجتہادیہ اور عقائد قیاسیہ اس طرح پر مل جاویں کہ عملاً اور اعتقاداً اصلی احکام مذہبی میں اور اُن میں کچھ تفرقہ اور تمیز نہ رہے ، تو بلاشبہ وہ بھی انسان کی ترقی اور تہذیب کا ، مثل مذہب غلط کے ، مانع قوی ہے ۔ الا سچا مذہب جیساکہ ٹھیٹ مذہب اسلام ہے ، وہ کبھی عارج ترقیٔ انسان نہیں ہوسکتا ، کیونکہ اس مذہب کے احکام اور تہذیب و شائستگی کے کام دونوں متحد ہوتے ہیں ۔ والسّلامُ علےٰ من اتّبع الھُدیٰ ؕ

کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیئے

جب کہ ہم کسی قوم کو تہذیب کی طرف مائل کرتے ہیں، تو ہم کو ضرور ہے کہ ہم یہ بھی بتادیں کہ اس قوم کو کن کن چیزوں میں تہذیب کرنی چاہیئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے جو حالات ہیں، اُن کے لحاظ سے ہمارے خیال میں آتا ہے کہ مفصلہ ذیل چیزیں ہیں جن کی تہذیب پر اُن کو متوجہ ہونا چاہیئے:۔

آزادیٔ رائے — مسلمانوں کی رائے، اور ان کے خیالات، ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے اور رسومات کے پابند رہتے رہتے ایسے پست اور پامال ہو گئے ہیں، جن کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔ پس جب تک کہ رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہوگی، اس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آنے کی۔

عقائد مذہبی — ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد مذہبی جو اُن کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں، اور جو ان کے دلوں میں ہیں، اور جن کا ان کو یقین بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقائد شرکیہ ان کے دلوں میں ہیں۔ پس اپنے عقائد کو ہیئتِ اسلام کے مطابق کرنا تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔

خیالات و افعال مذہبی — ہندوستان کے مسلمانوں میں صدہا خیال اور توہمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعال مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں حالانکہ انکو مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ پس ہم کو مہذب ہونے کے لئے ان کی تہذیب درکار ہے۔

ان تمام چیزوں کو جو مذہب سے متعلق ہیں، ہم نے تہذیب و شائستگی میں اس لئے داخل کیا ہے کہ قوم کے مہذب ہونے پر مذہب کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ پس جسقدر جس قوم کے مذہب میں نقص ہے اتنا ہی اُس کی پوری تہذیب میں نقصان ہے۔

کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے

تعلیم اطفال — مذہب کے بعد جو چیز سب سے ضروری ہے، وہ تعلیم ہے۔ ہم کو زمانۂ گذشتہ اور حال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقۂ تعلیم معین کرنا چاہیئے، جس سے علوم دینی اور دُنیوی، دونوں قسم کی تعلیم کا، اعلیٰ درجہ تک ہم کو قابو ملے۔

عورتوں کی تعلیم — کچھ شبہہ نہیں کہ قومی تہذیب وشایستگی کے لیۓ عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضرور ہے۔ پس ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیۓ، اور ان کو دستکاری سکھلانے کے لیۓ، کوئی عمدہ بندوبست کرنا چاہیۓ۔

سامانِ تعلیم — ہمارے لیۓ صرف طریقۂ تعلیم معین کرنا ہی کافی نہ ہوگا؛ بلکہ آپس کی مدد، اور مجموعی ہمت اور فیاضی سے اس کا سر و سامان بھی مہیّا کر دینا ضرور ہوگا۔

ہنر و فن و حرفہ — اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن و حرفہ کو پھیلانا و ترقی دینا، قومی تہذیب کے لیۓ ایک بہت بڑا جزو ہے۔

مندرجۂ بالا باتیں وہ تھیں، جو مجموعاً و منفرداً، ہر شخص سے اور کُل قوم سے علاقہ رکھتی تھیں۔ اب ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں، جو ہر ایک شخص کی ذات سے علاقہ رکھتی ہیں، مگر ان کا اثر کُل قوم پہ ہوتا ہے، اور ہر ایک میں ان باتوں کے ہونے سے قومی تہذیب وشایستگی قرار پاتی ہے۔

خود غرضی — سب سے بڑا عیب ہم میں خود غرضی کا ہے، اور یہی مقدّم سبب قومی ذلت اور نامہذب ہونے کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے کہ رفاہِ عام کا جوش دل میں پیدا کریں، اور یقین جانیں کہ خود غرضی نے تمام قوم کی، اور اس کے ساتھ اپنی بھی، بربادی ہوگی۔ جس قوم کے لوگوں میں خود غرضی ہوتی ہے، جیسے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہے، تو وہ آپ اپنے تئیں برباد کرتے ہیں۔

عزّت اور غیرت — غیرت اور عزّت یہ دونوں آپس میں ایسی ملی ہوئی ہیں کہ کبھی جُدا نہیں ہوتیں۔ جس کو عزّت ہے اس کو غیرت ہے؛ جس کو غیرت ہے اس کو عزت ہے۔ اب مسلمانوں میں ان دونوں چیزوں کی، کمی کیا، بلکہ وہ معدوم ہو گئی ہیں۔ کس کو اس بات کی غیرت ہے کہ ہم کو کوئی جھوٹا خیال نہ کرے! کس

کو اس بات کا خیال ہے کہ ہم آپس میں اور معمولی باتوں میں بھی سچ کی عزت پر بٹّہ نہ لگائیں۔ کون ہے جو بلحاظ اپنی اخلاقی عزت کے کسی برائی کے فعل سے، بشرطیکہ اس میں سزائے دنیاوی کا اندیشہ نہو، بچ کر اپنے تئیں معزز رکھنا چاہتا ہے؟ مہذب اور شائستہ قوموں میں ان باتوں کا بہت خیال ہے۔

ضبط اوقات — ہماری قومی تہذیب و شائستگی میں اوقات کے منضبط نہ ہونے سے بڑا نقصان پہونچا ہے۔ ہر ایک کو اپنے خاص کاموں میں اپنے خاص اوقات کا، اور جو کام عام قوموں سے متعلق ہیں، اُن میں تمام قوم کو یکساں اوقات منضبط کرنا چاہیئے، کہ یہ بھی ایک اصل اصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے۔

اخلاق — بالفعل مدار اخلاق ہم لوگوں میں اس پر رہ گیا ہے کہ جس کسی سے ملے، کچھ ہنس کر سلام کیا! کچھ محبت کی جھوٹی باتیں بنائیں! دو چار میٹھی باتیں سنائیں! کچھ اپنی جھوٹی نیازمندی کا اظہار کیا! کچھ ان کی جھوٹی تعریف کی، آؤ بھگت کی! اور دل میں کہا کہ خوب اُلّو بنایا۔ جب وہ چلا گیا تو بُرا کہنے لگے! یا جو باتیں کی تھیں اُن کا نقش بر آب کا سا بھی نشان باقی نہ تھا۔ یہ سب باتیں انسان کے دل کو اور اس کے اخلاق کو خراب کر دیتی ہیں۔ بلاشبہہ ہم کو سب سے جُھک کر اور خندہ پیشانی سے ملنا چاہیئے! مگر وہیں تک، جہاں تک کہ انسانیت کا مقتضا ہے! مگر اس کو مکّاری کی حد تک نہ پہونچانا چاہیئے۔

صدقِ مقال — یہ تو وہ صفت ہے جو انسان کو قطب و ابدال کے درجہ سے بھی بڑھا دیتی ہے۔ مگر یہاں ہمارا مطلب دنیاوی باتوں میں سچے پن کا ہے۔ ضرور ہے کہ سب لوگ سچ میں عزت سمجھیں۔ ایک شخص دوسرے کی بات کو سچ سمجھے، تاکہ قائل کو قبل کلام اس بات کی غیرت ہو کہ سامع میرے اس قول کو جھوٹ نہ سمجھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں سے خوش طبعی میں کہتے ہیں کہ "کیوں جھوٹ بولتا ہے!" آپس میں ایک دوست دوسرے دوست سے کہتا ہے کہ "میاں! کیوں جھوٹ بولتے ہو!" ان باتوں سے جھوٹ کے عیب اور جھوٹ کے طعنہ کی غیرت دل سے جاتی

رہتی ہے، جو بڑا سبب ذلت قومی اور نامہذب اور ناشائستہ ہونے قوم کا ہے۔

دوستوں سے راہ و رسم --- ہماری راہ و رسم جو دوستوں سے ہے، اس میں بھی نہایت نقص ہیں۔ ہم آپس میں اس طرح نہیں ملتے، جیسے انسان انسان سے ملتے ہیں؛ بلکہ اس طرح پر ملتے ہیں جیسے حیوان آپس میں ملتے ہیں۔ ان کا تمام طریقوں اور قاعدوں میں تہذیب کرنا ایک بڑا ضروری امر ہے۔

کلام و سخن --- طرز گفتگو اور سیاق کلام بھی جزو اعظم تہذیب و شائستگی کا ہے، جس کی ہم میں بہت کسر ہے۔ ہمارے کلام میں وہ الفاظ جو مہذبانہ گفتگو میں ہوتے ہیں، نہایت کم مستعمل ہیں، اور اس لئے اس کی اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔

لب و لہجہ --- اس کو بھی تہذیب میں بڑا دخل ہے۔ اکھڑ لہجہ، یا اس قسم کی آواز، جس سے شبہہ ہو کہ آدمی بولتے ہیں یا جانور لڑتے ہیں، ناشائستہ ہونے کی نشانی ہے۔ کسی قدر اس پر بھی ہم کو توجہ درکار ہے۔

طریق زندگی --- یہ تو ہمارا ایسا ابتر و خراب ہے کہ ہم بے مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے جانور ایسے ہیں، جن کا طریق زندگی ہمارے طریق زندگی سے نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔

صفائی --- بدن اور گھر اور لباس سب کی صفائی تہذیب میں داخل ہے۔ انگریزی مثل ہے کہ "خدا اور خدا کے بعد صفائی۔" مسلمانوں کے ہاں بھی حدیث ہے کہ "الطہور شطر الایمان" مگر ہم مسلمان بہت کم اس کی طرف متوجہ ہیں۔ صورت دیکھو تو واہ وا! گھر دیکھو تو سبحان اللہ! اس لئے ہم کو صفائی پر توجہ کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

طرز لباس --- لباس کی قطع اور وضع درست ہونی بہت بڑی نشانی تربیت یافتہ ہونے کی ہے۔ دیکھو کہ تمام دنیا میں جس قدر وحشیانہ پن کم ہوتا گیا، اسی قدر لباس کی درستی ہوتی گئی۔ پس ہم کو اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو کر دیکھنا چاہیے کہ کس قسم کی ترمیم کے لائق ہے۔

طریق اکل و شرب:— اگر ہم تعصب نہ کریں اور انصاف سے دیکھیں، تو ہمارا طریق اکل و شرب ایسا ہے کہ جو قومیں ہم سے زیادہ صفائی سے کھاتی ہیں، جب وہ ہم کو کھاتے ہوئے دیکھتی ہیں، تو ان کو قے آتی ہے۔

تدبیر منزل:— ہماری تدبیر منزل یعنی انتظام خانہ داری ایسا ابتر و خراب ہے، جس میں نہایت درجہ کی اصلاح و ترقی کی حاجت ہے۔

رفاہ عورتوں کی حالت میں —— اصلی حالت عورتوں کی بلاشبہہ ترقی کے کے لائق ہے، اور ہمارا برتاؤ عورتوں کے ساتھ بہت سی اصلاح اور تہذیب کا محتاج ہے۔

کثرت ازدواج —— یہ رواج نہایت نالائق ہے، خدا اور خدا کے رسول کے حکم کے برخلاف، برتا جاتا ہے۔ یہ ایسی بدخصلت مسلمانوں میں جاری ہے جسکی بدولت اسلام کو شرمندگی و بدنامی ہے۔

غلامی —— ہمارے دل میں اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ درحقیقت یہ رسم خلاف مسلمانی مذہب، اور فی نفسہ خراب و نالائق، تھی۔ اس لیئے ہم کو اس پر توجہ کرنے کی ضرورت باقی ہے۔

رسوماتِ شادی و غمی —— جو رسومات شادی کی ہم مسلمانوں میں رائج ہیں، ایک بھی ان میں سے مذہب اسلام کی رسم نہیں ہے! اور جیسی نالائق اور نامہذب وہ رسمیں ہیں، شاید ہی اور کوئی رسم اس سے زیادہ ناشایستہ اور نامہذب ہوگی۔ اسی طرح رسومات غمی کا حال ہے، کہ برخلاف مذہب اسلام کے ہم نے یہ نامہذب اور ناشایستہ رسمیں اختیار کرلی ہیں۔ خدا رحمت کرے مولوی اسمٰعیلؒ شہید پر، جن کی بدولت بہت سی نامہذب و ناشایستہ رسمیں شادی و غمی کی ہم میں سے چھوٹ گئی ہیں! مگر اس پر بھی بہت کچھ باقی ہے، جنکی تہذیب پر ہم کو متوجہ ہونا چاہیئے۔

ترقی زراعت —— کھیتی باڑی کی ترقی اور کاشتکاروں کی حالت کی بہتری،

قومی ترقی اور تہذیب میں بڑا اثر رکھتی ہے؛ اور اس میں ہم کو بہت کچھ کرنا ہے۔
تجارت - یہ سب سے آخر جزو ہے قومی ترقی اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کا! اور ہم مسلمانوں میں سے یہ امر بالکل متروک ہو گیا ہے۔ پس ہم کو اپنی قوم میں اس کا رواج دینا، اور عمدہ اصول پر اس کو قائم کرنا، ایک بہت بڑا امر واسطے تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کا ہوگا۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ تمام دنیا کی چیزوں کی ترقی ہم سے کیونکر ہو سکتی ہے۔ اس لیئے کہ اگر ہم متوجہ ہوں گے اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے پر دل لگا دیں گے تو سب کچھ ہم سے ہو سکے گا۔ یہ باتیں ظاہر میں بہت سی معلوم ہوتی ہیں، لیکن آپس میں ایک دوسرے سے ایسا علاقہ رکھتی ہیں، کہ جب ایک بات میں ترقی شروع ہوتی ہے، تو ہر ایک بات میں از خود ترقی ہو جاتی ہے۔ پر کوشش شرط ہے۔
السعی منی والاتمام من اللہ

مہذّب قوموں کی پیروی

چھوٹا بچہ اپنے سے بڑے لڑکے کی باتوں کی پیروی کرتا ہے؛ اور کم سمجھ والا اس کی جس کو وہ اپنے سے زیادہ سمجھدار سمجھتا ہے؛ اور ناواقف اُس کی، جس کو وہ اپنے سے زیادہ واقفکار جانتا ہے۔ اسی طرح نامہذب قوم کو تہذیب یافتہ قوم کی پیروی کرنی ضرور پڑتی ہے۔ مگر بعضی دفعہ یہ پیروی ایسی اندھا دھندی سے ہوتی ہے جس سے بجائے اس کے کہ اُس پیروی سے فائدہ اٹھاویں، اُلٹا نقصان حاصل ہوتا ہے؛ اور جسقدر کہ ہم نامہذب ہوتے ہیں، اس سے اور زیادہ ناشایستہ ہوجاتے ہیں۔

نامہذب آدمی جب تربیت یافتہ قوم کی صحبت میں جاتا ہے، تو اُن لوگوں کو بہت عمدہ پاتا ہے، اور ہر بات میں اُن کو کامل سمجھتا ہے۔ ہر جگہ انکی تعریف سنتا ہے؛ مگر اُن میں جو خراب عادتیں ہیں، اُن کو بھی دیکھتا ہے، مثلاً شراب پینا، جوا کھیلنا وغیرہ۔ پس یہ شخص ان باتوں کو بھی ان کے کمالوں ہی میں تصوّر کر لیتا ہے۔ ان میں جو خوبیاں اور کمالات درحقیقت ہیں، انکو تو وہ حاصل نہیں کرتا، اور نہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر جو بری عادتیں ان میں ہیں؛ ان کو بہت جلد سیکھ لیتا ہے۔

ایسا کرنا درحقیقت اس آدمی کی غلطی ہے کہ اس نے ان کے نقصوں کو اُن کا کمال سمجھا ہے۔ وہ لوگ بسبب کسی دوسرے کمال و لیاقت اور خوبی کے جو ان میں ہے، اور بسبب دوسری عمدہ خصلتوں کے جو انھوں نے حاصل کی ہیں، مہذّب و شایستہ کہلاتے ہیں؛ نہ بسبب ان باتوں کے، جن کو اس نے سیکھا ہے۔

مُہذب قوموں کی پیروی

بلاشبہہ مہذب آدمیوں کی بُرائیاں اُن کی بہت سی خوبیوں اور کمالوں کے سبب سے چھُپ جاتی ہیں، اور لوگ اُن پر بہت کم خیال کرتے ہیں! تاہم وہ بُرائیاں کچھ ہنر نہیں ہو جاتیں، بلکہ جو بُرائی ہے وہ برائی ہی رہتی ہے، گو کہ ایک مہذب قوم ہی میں کیوں نہ ہو۔

ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ کوئی قوم وہ کیسی ہی عمدہ اور مہذّب ہو، مگر جو بُرائیاں اس میں ہیں، وہ اس کے وصف نہیں ہیں، بلکہ ان کے کمال کی کمی ہے، جسکی پیروی ہم کو کرنی نہیں چاہیئے۔ اگر ایک خوبصورت آدمی کے منھ پر مُسّہ ہو، تو ہم کو خوبصورت بننے کے لئے ویسا ہی مُسّہ اپنے منھ پر نہ بنانا چاہیئے! کیونکہ وہ مُسّہ اس کی خوبصُورتی نہیں ہے، بلکہ اس کی خوبصورتی کا نقصان ہے۔ ایسی حالت میں ہم کو یہ خیال کرنا مناسب ہے کہ اگر یہ مُسّہ بھی اس کے منھ پر نہ ہوتا، تو کتنا اور خوبصورت ہو جاتا!

ہم بلاشبہہ اپنی قوم کو، اپنے ہم وطنوں کو، سولائزڈ قوم کی پیروی کی ترغیب کرتے ہیں! مگر ان سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان میں جو خوبیاں ہیں، اور جن کے سبب وہ معزز اور قابلِ ادب سمجھی جاتی ہیں، اور سولائزڈ شمار ہوتی ہیں، ان کی پیروی کریں! نہ اُن باتوں کی، جو ان کے کمال میں نقص کا باعث ہیں۔

اسی سبب سے، جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری قوم نے کسی سولائزڈ قوم کی عمدہ خصلتوں اور عادتوں میں پیروی کی تو ہم کو بہت خوشی ہوتی ہے! اور جب ہم یہ سنتے ہیں کہ اس نے ان کی بُرائیوں کی پیروی کی، اور شراب پینی شروع کی، اور پکا متوالا ہو گیا، اور جوا کھیلنا سیکھا اور بے قید ہو گیا، تو ہم کو نہایت افسوس ہوتا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری قوم عمدہ باتوں کو سیکھے گی، اور بُری باتوں کو ہمیشہ بُرا سمجھے گی۔

ملک اور اسکی گورنمنٹ

ملک جب نامہذب ہوتا ہے، تو ضرور کچھ نہ کچھ گورنمنٹ میں ناتہذیبی آجاتی ہے؛ اور جب گورنمنٹ مہذب ہوتی ہے تو کسی نہ کسی قدر تہذیب ملک میں ہوتی جاتی ہے۔

ملک کا نامہذب ہونا تو اس ملک کے باشندوں کا نامہذب ہونا ہوتا ہے؛ کیونکہ جب یہ کہیں کہ انگلینڈ، فرانس، جرمنی اور امریکہ نہایت مہذب ملک ہیں، تو اس کے معنی یہی ہونگے کہ وہاں کے رہنے والے تہذیب و تربیت یافتہ ہیں۔ ہندوستان کو جو نامہذب یا نیم وحشی ملک بتلایا جاتا ہے، اس کا یہی سبب ہے کہ یہاں کے رہنے والے نامہذب یا نیم وحشی گنے جاتے ہیں۔

گورنمنٹ کا فرض یہ ہے کہ جن لوگوں پر وہ حکومت کرتی ہے، اُن کے حقوق کی، خواہ وہ حقوق مال و جائداد سے متعلق ہوں، خواہ کسب و پیشہ و معاش سے، خواہ آزادیٔ مذہب و آزادیٔ رائے اور آزادیٔ زندگی سے، اُن کی محافظ ہو؛ غیر مساوی قوتوں سے کسی کو نقصان نہ پہونچنے دے؛ کمزور مستحق کو غیر مستحق زورآور سے پناہ میں رکھے؛ ہر شخص اپنی ملکیت سے اپنے ہنر سے پورا پورا متمتع ہو۔

اور اس کا مہذب ہونا یہ ہے کہ ان تمام فرائض کے پورا کرنے کو قوانین اسکی سلطنت میں جاری ہوں۔ ہر شخص ادنیٰ سے اعلیٰ تک، یہاں تک کہ خود گورنمنٹ بھی اُن قوانین کے تابع ہو؛ اور وہ قوانین ایسے ہوں کہ تمام رعایا کے حقوق اس کی رُو سے مساوی ہوں؛ اور اس کے ساتھ وہ قوت بھی ہو (جس کو گورنمنٹ کہتے ہیں) اور جو ہر شخص کو بلا لحاظ مرتبہ ان قوانین کا پورا پورا مطیع کرے۔ جس گورنمنٹ میں یہ چیزیں نہیں ہیں، وہ گورنمنٹ نامہذب و ناتربیت یافتہ کہلاتی ہے؛ اور اُس کے ملک میں

بھی امن نہیں رہتا؛ ملک کی، مال کی، دولت کی، قوم کی، رعایا کی، کبھی ترقی نہیں ہوتی۔

ایسا ملک اور ایسی قوم ہمیشہ تنزل کی حالت میں رہتی ہے۔ تہذیب و شائستگی کی ہوا بھی وہاں تک نہیں جاتی۔ کوئی مستحکم قانون اس کے ہاں نہیں ہوتا۔ کسی شخص کے حقوق محفوظ نہیں ہوتے۔ کوئی شخص مال سے پورا پورا تمتع حاصل نہیں کر سکتا۔ نہ کبھی ملک میں امن ہوتا ہے۔ اکثر مسلمان گورنمنٹوں کا جو کہ اس وقت دنیا میں موجود ہیں یہی حال ہے: ایران کا حال دیکھ لو! افغانستان و ترکستان پر نظر ڈال لو!

دنیا میں ۲ دو قسم کے اُمور ہیں، ایک روحانی اور دوسرے جسمانی؛ یا یوں کہو کہ ایک دینی اور دوسرے دنیاوی۔ سچا مذہب امور دنیاوی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا؛ ہاں چند معظم باتوں کو، جنکا اثر اخلاق پر زیادہ تر ہے، اور گو وہ دنیاوی ہوں، بیان کر دیتا ہے۔ کوئی شبہہ نہیں کہ اسلام بھی، جو بیشک ایک سچا مذہب ہے، انہی اصول پر مبنی ہے۔ اور ہمارے رسول مقبول کا یہ قول کہ "ما اتاکم من امر دینکم فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا" اس پر دلیل کامل ہے۔ اور قرب زمانہ نبوت میں اسی اصول پر عملدرآمد رہا، اور کچھ کچھ اس کا اثر عہد خلفاء تک بھی باقی رہا۔

اگلے زمانہ کے نیک اور متدین، مگر مذہب کی طرف زیادہ متوجہ عالموں نے یہ خیال کیا کہ جہاں تک ہو سکے ہر ایک کام کسی مذہب کی سند پر کیا جائے۔ پس جو واقعہ یا امر پیش آتا، اُس کے لئے فکر کرتے کہ اُس کو کس مذہبی سند سے متعلق کریں؛ اور پھر خواہ مخواہ کھینچ تان کر، اور تاویلات اور استدلالات دور از کار کر کر، کسی نہ کسی سند سے متعلق کر دیتے تھے؛ یا کسی اصول عام کے، جس کو خود انہیں نے قایم کیا تھا، تابع کر دیتے تھے۔ ان علماء کے اقوال و استدلالات رفتہ رفتہ مدوّن ہونے لگے؛ جن کی بدولت کتب فقہ و اصول فقہ ہمارے ہاں پیدا ہو گئیں۔ اس زمانہ میں تمام لوگ ان علماء کے اقوال و استدلال کو ایک رائے سے زیادہ رتبہ کا نہیں سمجھتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ، خود

اُن علمار کے اقوال بطور سند کے تصوّر ہونے لگے! اور پھر ایک زمانہ کے بعد وہی مذہب اسلام سمجھا گیا، اور شرع اس کا نام ہو گیا! اور غیر مذہب والوں نے شرع محمدی اس کا نام رکھا! اور جو نقائص اس میں معلوم ہوئے، اس سے اسلام میں انہوں نے نقص سمجھے، حالانکہ اسلام اس سے بالکل بری ہے۔ اگر بالفرض تمام اجتہادات واستدلالات حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں نقص ثابت ہو جاوے، تو بھی اسلام میں کچھ نقص نہیں آتا، وہ جیسا خدا کے ہاں سے اُترا، ویسا ہی پاک وصاف ہے۔

اس طریقہ سے جو علمار نے اختیار کیا ایک یہ فائدہ تو بلاشبہ ہوا کہ مسلمانی فقہ ایسی عمدہ اور موجّہ اور مدلّل ہو گئی کہ کسی قوم میں ویسی عمدہ فقہ نہیں، مگر مفصلہ ذیل نقصان بھی پیدا ہوئے:-

اوّل یہ کہ تمام لوگوں کے خیالوں میں یہ غلط مسئلہ جم گیا کہ مذہب اسلام تمام دنیاوی امور سے بھی متعلق ہے، اور کوئی دنیاوی کام بے سند یا اجازت مذہبی کے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے، یہ کہ جو مسائل علمار نے اپنے اجتہاد و قیاس سے، و بلحاظ حالاتِ وقت وعادتِ اہل زمانہ، یا رواجِ ملک قرار دئے تھے، اگر وہ مسائل رتبہ میں بطور رائے ایک عالم یا جج یا مفتی و قاضی کے رہتے تو کچھ نقصان نہیں تھا! مگر نقصان یہ ہوا کہ وہ عین مذہب اسلام کے مسائل قرار پا گئے اور سوائے پیغمبر خدا صلعم کے اور بہت سے لوگوں کو مرتبہ شارع ہونے کا مل گیا۔

تیسرے، یہ کہ اب ان مسائل کے خلاف کرنا، خلاف مذہب اسلام کے کرنا تصوّر ہوا! جو فی الحقیقت ایسا تصور کرنا خلاف مذہب اسلام ہے، نہ اُس کے برخلاف کرنا!

چوتھے، یہ کہ جب یہ خیال جما کہ مسائل مذکورہ عین مذہب اسلام ہے، تو ضرور ہوا کہ اس کو خدا کا دیا ہوا مانا جاوے! اور جب خدا کا دیا ہوا مانا گیا، تو ضرور ہوا کہ اس کو کافی اور کامل سمجھا جاوے۔ اس خیال نے اس بات پر مائل

کیا کہ کتب فقہیہ واسطے سیاست ملکیہ کے بالکل کافی ہیں! اور اب ہم کو نہ سِول کوڈ کی ضرورت ہے، نہ سِول پرسیڈیور کی! نہ کرِمنَل کوڈ کی ضرورت ہے، نہ کرِمنَل پرسیڈیور کی! نہ ریونیو کوڈ کی ضرورت ہے، اور نہ ٹریڈ کوڈ کی! حالانکہ کتب موجودہ فقہیہ ان میں سے ایک کے لئے بھی کافی نہیں ہیں۔

ان تمام نقصوں نے کُل سلطنت ہائے اسلامیہ کو ڈبو دیا، اور غارت و برباد کر دیا! اور جو رہی سہی ہیں وہ بھی غارت و برباد ہوتی جاتی ہیں۔ قبول کرد کہ علمائے متقدمین اسلام بڑے عالم تھے، بڑے ذہین تھے، بڑے فلسفی تھے، بڑے منتظم تھے! مگر جو کچھ کہ انہوں نے دنیاوی امور کی نسبت کیا اور لکھا وہ اس زمانہ کی حالت کے نہایت مناسب تھا! اور یہی سبب تھا کہ اس زمانہ میں سب سے مقدم اور سب سے اعلیٰ، اور سب سے بڑے فتحمند تھے۔ مگر زمانہ روز بروز بدلتا رہتا ہے۔

علم

جہاں اور بہت سے عجائباتِ قدرتِ الہٰی ہیں، اُنہی میں سے انسان کے خیالات بھی نہایت عجیب ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قسم کی مخلوقات ایک ہی سا خیال رکھتی ہے۔ جانوروں کی وہ حرکات اور افعال جو جاندار ہونے کے سبب سے ہیں، اور وہ چیز جو محرک ان افعال یا حرکات کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ہے، اُس کا کچھ ہی نام رکھو، مگر وہ وہی چیز ہے، جس کو انسانی حالت میں خیال کہتے ہیں۔

تمام افعال اور حرکات جانوروں کی بلاشبہ ارادی ہیں، اور کچھ شک نہیں کہ وہ متحرک بالارادہ ہیں۔ اُن کی تمام حرکتوں کا باعث "بالواسطہ یا بلا واسطہ" ایک خیال جلبِ منفعت مادی، جیسے غذا اور مسکن وغیرہ؛ یا غیر مادی؛ جیسے فرحت وانبساط اور بشاشت؛ یا خیال دفع مضرت مادی و غیر مادی کا ہوتا ہے۔ ہم نہیں پاتے کہ انسان میں اور کوئی چیز اس سے زیادہ ہے۔ بلاشبہ اتنا فرق پاتے ہیں کہ جانور میں وہ خیالات محدود ہیں، اور انسان میں نامحدود ہیں۔

مگر تعجب تو ہم کو اس بات سے ہوتا ہے کہ ہر گاہ ایک قسم کے جانوروں میں ایک ہی سے خیالات ہیں، اور اُن پر وہ سب ایک ہی سا یقین کامل رکھتے ہیں، تو تمام انسان بھی باوجود یکہ ایک قسم کے جاندار ہیں، ایک سے خیالات اور ایک ہی سا یقین کیوں نہیں رکھتے ہیں!

کبھی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جانوروں کے خیالات محدود ہونے کے سبب متفق ہیں؛ اور انسان کے خیالات میں نامحدود ہونے کے سبب وہ صفت نہیں ہے۔ مگر یہ بات

تسلیم نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ نامحدود ہونے کے لئے مختلف ہونا ضرور نہیں ہے۔ پس انسانوں کے خیالات سے جہاں تک ہم کو واقفیت ہو، اسی قدر عجائباتِ قدرتِ الٰہی سے ہم کو زیادہ واقفیت ہوتی ہے اور ان خیالات کا صحیح ہونا، یا غیر صحیح ہونا ہمارے اس فائدے میں کچھ نقصان نہیں پہونچاتا؛ بلکہ درصورت مختلف ہونے کے اور بھی زیادہ فائدہ دیتا ہے۔ اس لئے ہم اپنے اس آرٹکل میں ایک انسان کے خیالات بیان کرتے ہیں جنکو وہ اس طرح پر کہتا ہے۔

"مجکو خیال آیا کہ جس قدر اور جانوروں کو کرنا ہے، اتنا ہی مجکو بھی کرنا ہے، یا اس سے زیادہ کرنا ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ آیا کہ انسان کے سوا تمام جاندار مخلوقات کیلئے جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان کے بنانے والے کاریگر نے سب کچھ ان کے ساتھ بنادی ہیں۔ اُن کو اُن چیزوں کے بہم پہونچانے یا پیدا کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ تمام جانداروں کی خوراک بغیر ان کی سعی و تدبیر کے پیدا ہوتی ہے۔ سرد ملک کے جانوروں کیلئے نہایت عمدہ پشمینہ کا گرم لباس ان کے بدنوں پر پیدا کیا ہے۔ پرند جانوروں کے لئے مینھ سے بچنے کا بارانی کوٹ انہی کے بدنوں پر سیا ہے۔ گرم ملک کے جانوروں کے لئے اُسی آب و ہوا کے مناسب اُن کا جامہ قطع کیا ہے۔ مگر انسان کے لئے کچھ نہیں کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یہ سب کچھ خود کرنا ہے۔

پھر میں نے خیال کیا کہ حیوان اپنے کاموں کے کرنے کے لئے، کسی سے کچھ سیکھنے یا تعلیم پانے کے محتاج نہیں ہوتے، خود سیکھے سکھائے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھی کو رس چوسنے کے لئے عمدہ قسم کے ماخذوں کی شناخت کوئی نہیں بتاتا؛ اور اپنے گھروں کو ایسی عمدہ تقسیم سے نکالنا جس میں ایک بڑا مہندس بھی حیران ہو جاوے، کوئی نہیں پڑھاتا۔ بئے کو ایسا عمدہ اور محفوظ کاشانہ بنانا کوئی نہیں سکھاتا۔ مگر انسان کو بغیر سیکھے کچھ بھی نہیں آتا۔

پھر میں نے خیال کیا کہ حیوان کے کام، خواہ افعال جوارح سے ہوں یا

دوسری قسم سے ! اور خواہ وہ از خود ان کو آئے ہوں، یا تعلیم سے، نہایت محدود ہیں۔ مگر انسان کے ہر قسم کے کام نامحدود ہیں۔ ان سب باتوں سے میں نے خیال کیا کہ انسان کو اور جانوروں سے بہت کچھ زیادہ کرنا ہے۔

پھر میں نے خیال کیا کہ ایسے بڑے کاریگر نے جو انسان کو اور جانوروں سے بھی زیادہ درندہ بنایا ہے، اور طرح طرح کی مشکلات میں ڈالا ہے، تو کیا چیز اس کو دی ہے، جس سے وہ یہ سب چیزیں کر سکتا ہے، اور تمام مشکلوں پر فتح پا سکتا ہے؟ اتنے میں میرا دل بول اٹھا کہ "عقل!"

میں یہ بات سُنکر سوچ میں گیا کہ کیا یہ بات سچ ہے؟ مگر میں نے خیال کیا کہ عقل سے تو یہ کام نہیں نکل سکتا۔ نہ تو وہ خود یہ کام نکال سکتی ہے، اور نہ اس کے بغیر یہ مشکل حل ہو سکتی ہے۔ یہ تو کسی دوسری چیز کے حاصل کرنے کو بطور آلہ کے ہے، جیسے کہ سونا چاندی ہماری بھوک نہیں کھو سکتا، مگر اس چیز کو ہم پہونچا دیتا ہے، جو ہماری بھوک کھو دیتی ہے۔ بہت سی تلاش اور جستجو میں نے کی، اور خیال دوڑایا کہ وہ کیا چیز ہے، جس کے حاصل کرنے کے لئے عقل بھی صرف آلہ ہے، تو خیال میں آیا کہ وہ چیز "عِلم" ہے جس کے معنی دانستن (جاننا) ہیں۔ تب میں سمجھا کہ مجھ کو اور جانوروں سے زیادہ جو کچھ کرنا ہے، وہ صرف تمام باتوں کی اصلیت دریافت کرنا ہے۔

تعلیم

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی روح بغیر تعلیم کے جیتا بڑے سنگ مرمر کے پہاڑ کی مانند ہے، کہ جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا، اس کا دھوندلا اور کھردرا پن دور نہیں کرتا، اس کو خراش تراش کر سڈول نہیں بناتا، اس کو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا، اس وقت تک اس کے جوہر اسی پہ چھپے رہتے ہیں، اور اس کی خوش نمائیں اور دلربا رنگتیں اور خوبصورت بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو، مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا، اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں، اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں، ظاہر نہیں ہوتیں۔

ارسطو نے تعلیم کے اثر کو مجسم مورتوں کے بنانے کی تشبیہ میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موہنی مورت ایک پتھر کے ڈھوکے میں چھپی ہوئی ہوتی ہے، مگر مورت بنانے کا ہنر صرف فضول چیزوں کو اس میں سے گھڑ دیتا ہے۔ مورت تو پتھر ہی میں ہوتی ہے، مگر آذر صرف اس کو نمود کر دیتا ہے۔ جو نسبت کہ مورت گھڑنے والے کو اس پتھر کے ڈھوکے سے ہے، وہی نسبت تعلیم کو انسان کی روح سے ہے۔

بڑے بڑے حکیم اور عالم، ولی و ابدال، نیک و عقلمند، بہادر و نامور ایک گنوار آدمی کی سی صورت میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں، مگر ان کی یہ تمام خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ جب ہم جاہل اور وحشی قوموں کے حالات

پڑھتا ہوں، تو اُن نیکیوں سے جو ان میں ہیں مگر ناشایستہ؛ اور اس دلیری اور جرأت سے جو ان میں ہے، مگر خوفناک؛ اور اس استقلال سے جو ان میں ہے مگر بے ڈھنگا؛ اور اس دانائی اور عقلمندی سے جو اُن میں ہے مگر جانوروں کے سے مکر و فریب سے ملی ہوئی؛ اور اس صبر و قناعت سے جو اُن میں ہے؛ اور گویا نا اُمیدیاں ہی ان کی امیدیں ہیں؛ نہایت خوش ہوتا ہوں۔ سچ ہے کہ انسان کے دل کے جوش مختلف طرح پر کام کرتے ہیں؛ اور جس قدر کم دبیش عقل کی ہدایت ان کو ہوتی ہے، اور جس قدر کہ عقل ان جوشوں کو درست کرتی ہے، اُسی قدر مختلف طور پر ان سے کام ہوتے ہیں۔

امریکہ کے حبشی غلاموں کا جب یہ حال سنتے ہیں کہ اپنے آقا کے مرنے پر، یا ایک کام سے چھڑا کر دوسرے کام کے لگائے جانے پر، جنگلوں کے درختوں میں لٹک کر اپنی جان دیدیتے ہیں؛ یا ایک ہندو عورت اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جل کر ستی ہو جاتی ہے، تو کون شخص ہے جو اُن کی وفاداری اور محبت کی تعریف نہ کرے گا، گو کہ کیسے ہی ناشایستہ اور نامہذب طور سے ظاہر ہوتی ہے؟ اس قسم کی اور وحشی قوموں کے دلوں میں بھی نہایت عمدہ عمدہ باتیں پائی جاتی ہیں، گو وہ وحشی پنے کی حالت میں کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر ان کی مناسب طور سے اور عمدہ تعلیم سے درستی کیجاوے، تو یہی وحشیانہ نیکیاں کس قدر ترقی پا سکتی ہیں؛ اور کیسے کیسے عمدہ کام اور مہذب و شایستہ نیکیاں ان سے پیدا ہو سکتی ہیں!

مجھ کو اسی بات کا رنج ہے کہ میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں، پر ناشایستہ، اُن میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں، پر خوفناک؛ ان میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں، پر بے ڈھنگا؛ ان کو نہایت دانا اور عقلمند پاتا ہوں، پر اکثر مکر و فریب اور زور سے ملے ہوئے؛ اُن میں صبر و قناعت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے، مگر غیر مفید اور بے موقع؛ پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ خصلتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاویں تو دین و دنیا دونوں کے لئے

کیسی کچھ مفید ہوں۔

تعلیم سے ہماری مراد، موافق عُرف عام کے، لکھنا پڑھنا سیکھنے سے ہے۔ ہر زمانہ میں لاکھوں کروڑوں آدمی مختلف مقاصد سے لکھنا پڑھنا سیکھتے رہے ہیں۔ عام مقصد، جس کے سبب سے تعلیم پر توجہ ہوتی ہے، خواہ تعلیم پانیوالے خود اس پہ متوجہ ہوں یا اطفال کے مربّیوں نے اطفال کی تعلیم پر توجہ کی ہو، یہ ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہوتی ہے کہ ایک جاہل کندۂ ناتراش سے لکھا پڑھا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے؛ اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوتی ہو، زندگی کے کاروبار میں اس کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہوتی ہے۔

ان تعلیم پانے والوں میں لاکھوں آدمی تو ایسے ہوتے ہیں کہ ادنیٰ درجہ تعلیم تک پہونچ کر، اور کچھ متوسط درجہ کی تعلیم تک پہونچ کر رہ جاتے ہیں؛ اور چند ایسے ہوتے ہیں، کہ متوسط درجہ کی تعلیم سے آگے بڑھتے ہیں، اور اپنے مذاق کے موافق علم کی شاخوں میں سے کسی شاخ کی تکمیل پہ مائل ہوتے ہیں۔ کوئی شاعر بننا چاہتا ہے، کوئی ادیب؛ کوئی فلسفہ میں ترقی کرتا ہے۔ کوئی ریاضیات میں؛ اور کوئی دینیات میں؛ علیٰ ہذ القیاس۔ مگر ہر ایک کے ساتھ حصول معاش کا خیال لگا رہتا ہے؛ اور جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے؛ اس کو ذریعۂ حصولِ معاش ضرور سمجھتا ہے۔

تعلیم، بغیر اس کے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی زبان اختیار کیجائے، غیر ممکن ہے۔ جس زمانہ میں جس زبان کا عروج ہوتا ہے، وہی زبان اس کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ اس زمانہ کی تعلیم میں، جو بذریعہ انگریزی زبان کے ہوتی ہے؛ اور اگلے زمانہ کی تعلیم میں، جو بذریعہ عربی زبان کے ہوتی تھی، یہ فرق ہے کہ اگلے زمانہ میں تعلیم کا سامان ایسا موجود اور مہیّا تھا کہ ہر شخص، ہر علم کی کسی شاخ میں، یا شاخوں میں، اس زمانہ کے موافق اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا، اور اس فن کا ماسٹر

ہونا چاہیے، تو ہو سکتا تھا! اور سوسائٹی جو اس زمانہ میں موجود تھی، اس تعلیم کی مدد کرتی تھی، اور اس پر عمدہ اخلاقی اثر ڈال کر اس کو اس سوسائٹی کے لائق کر لیتی تھی۔ اگلے زمانہ کی سوسائٹی بلحاظ اخلاق اور حسن معاشرت کے ایسی عمدہ تھی، کہ اس میں کوئی نقص اس زمانہ میں نہیں نکالا جا سکتا تھا، مگر افسوس ہے کہ زمانہ کے انقلاب کے ساتھ وہ قائم نہ رہی!

اس زمانہ کی تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے، اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص کسی علم کی کسی شاخ میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہے، تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاکر اس فن کا ماسٹر ہو سکے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم دینے والی وہ یونیورسٹیاں ہیں جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ وہ بلا شبہہ بی۔ اے اور ایم۔ اے۔ کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ مگر اس تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کہنا ہمارے نزدیک محض ناواجب ہے! بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجہ کی تعلیم ہے اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے۔

ہماری رائے میں اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے، ہندوستان میں جو قدیم سوسائٹی علمار اور نیک خدا پرست، رحمدل، نیک خصلت لوگوں سے مرکب تھی، وہ مدت ہوئی کہ مردہ ہو گئی ہے! اور نئی سوسائٹی، جو زمانہ حال کے موافق ہو، اب تک قائم نہیں ہوئی، یا مکمل نہیں ہوئی ہے۔

دماغی تعلیم جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا، کچھ شبہہ نہیں ہے کہ، انسان کو انسان، اور اس کی عقلی اور دماغی قوتوں کے کامل اور اس کے اخلاق کو عمدہ بنانے میں بہت کچھ مدد کرتی ہے، مگر جب مسئلہ حصول معاش پر نظر کی جاتی ہے، تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ یقینی امر ہے کہ محض علمی پیشوں میں حصول معاش کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں ہے! اور اس لیے ان کا اس طرف خیال جاتا ہے کہ حرفت اور فن کی تعلیم کو، جیسے سائنٹفک اور ٹیکنیکل ایجوکیشن سے تعبیر کیا جاتا ہے، زیادہ وسعت دی جاوے۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن کے معنی تو ہم آج تک نہیں سمجھے کہ اس سے کیا مراد ہے
اگر اس کی مراد حرفوں کی تعلیم سے ہے، جیسے لوہاری، نجاری، نوربافی وغیرہ
وغیرہ تو اس کی ضرورت تو ہم ہندوستان میں بہت کم پاتے ہیں۔ اگر یورپ کو یا اور
کسی ملک کو اس باب میں تفوق ہے، تو وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ جو کام ہندوستان
میں ہاتھوں سے ہوتا ہے، وہ ان ملکوں میں کلوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ مگر کلیں
قائم کرنے والے وہ لوگ نہیں ہیں جو ان میں کام کرتے ہیں، بلکہ کلوں کو قائم کرنے والی
ایک جدا جماعت ہے۔

سائنسز بلاشبہہ نہایت عمدہ چیزیں ہیں؛ اور سائنسز کا جاننے والا آج کل کے
زمانہ میں قریب قریب ہر حرفت پر پورا پورا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، اور معاش
حاصل کرنے کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ اس کے پاس ہوتا ہے، جیسا کہ یورپ کے
ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔

تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت کو ہم معنی سمجھنا بڑی غلطی ہے، بلکہ وہ جدا جدا دو چیزیں ہیں. جو کچھ انسان میں ہے، اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے؛ اور اس کو کسی کام کے لائق کرنا، اس کا تربیت کرنا ہے؛ مثلاً، جو قوتیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے؛ اور اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اس کی تربیت ہے.

انسان کو تعلیم دینا درحقیقت کسی چیز کو باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ اس کے دل کی سوتوں کا کھولنا اور اندر کے سرچشمہ کے پانی کو باہر نکالنا ہے، جو صرف اندرونی قویٰ کو حرکت میں لانے، اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے؛ اور انسان کو تربیت کرنا، اس کے لئے سامان کا مہیا کرنا، اور اس سے کام کا لینا ہے؛ جیسے جہاز طیار ہونے کے بعد اس پر بوجھ لادنا، اور حوض بنانے کے بعد اس میں پانی کا بھرنا. پس تربیت پاتے سے تعلیم کا پانا بھی ضرور نہیں ہے. تربیت چاہو جتنی کرو! اور اس کے دل کو تربیت کرتے کرتے منھ تک بھردو! مگر اس سے دل کی سرچی سوتیں نہیں کھلتیں، بلکہ بالکل بند ہو جاتی ہیں.

اندرونی قویٰ کو حرکت دئے بغیر تربیت تو ہو جاتی ہے، مگر تعلیم کبھی نہیں ہوتی. اس لئے ممکن ہے کہ ایک شخص کی تربیت تو بہت اچھی ہو، اور تعلیم بہت بری. یہی حال ٹھیک ٹھیک ہم مسلمانوں کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے؛ کہ تربیت تو نہایت اچھی ہے، اور تعلیم کچھ نہیں. ظاہر میں دیکھو، تو طمطراق بہت کچھ؛ مگر جب اصلیت ڈھونڈھو، تو کچھ نہیں. بھاری بھرکم تو عمامہ و دستار، جبہ

دکرنے سے بہت کچھ ! مگر دل کی اور اندرونی قویٰ کی شگفتگی دیکھو، تو کچھ بھی نہیں.

نہایت عمدہ قول ہے کہ کتابوں کا پڑھا دینا تو تعلیم کا نہایت ادنیٰ اور سب سے زیادہ حقیر جزو ہے ! بلکہ اس قسم کے بہت سے پڑھنے سے جس میں اندرونی قویٰ کی تحریک اور شگفتگی نہ ہو، جسقدر دل کے قوائے کمزور اور ناکارہ ہو جاتے ہیں ایسے اور کسی چیز سے نہیں ہوتے.

ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں: کہ ان کے روحانی قوائے بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں ! اور صرف زبانی ٹک ٹک یا تکبر و غرور، اور اپنے آپ کو بے مثل و نظیر، قابل ادب ماننے سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا ! زندہ ہوتے ہیں، مگر دلی اور روحانی قویٰ کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردار ہوتے ہیں ! کتابیں پڑھتے ہیں، اور جسقدر عمدہ کتابیں افراط سے بہم پہونچیں اُن کو اور زیادہ پڑھتے ہیں، اور ان سے تربیت حاصل کرتے ہیں، اور ایسے بیل کے مانند ہو جاتے ہیں جو برابر چرتا ہے، اور پھر بھی چراگاہ ہی میں رہنے کی خواہش کرتا ہے. پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی، بلکہ وہ کتابی علم خود اُن پر بوجھ ہوتا ہے.

ہمارا مطلب یہ ہے کہ تمام خرابیوں کی جڑ جو ہم پر نازل ہیں یہی ہے کہ ہم نے اپنے دل کو، اور اپنے اندرونی قویٰ کو، بالکل خراب کر دیا ہے. علم جو حاصل کرتے ہیں، وہ بھی بعوض اسی کے کہ روحانی قویٰ کو سرسبز و شاداب کرے، ان کو پژمردہ کر دیتا ہے ! اور ہمارے قویٰ کو جو درحقیقت سرچشمے تمام نیکیوں کے ہیں، بالکل کمزور اور ناکارہ کر دیتا ہے ! اور ہماری حالت تمام معاملات میں، کیا دین کے کیا دنیا کے، خراب ہوتی ہوئی چلی جاتی ہے.

پس ہم کو اپنے پر رحم کرنا چاہیئے ! اور ایسی تعلیم کو اختیار کرنا چاہیئے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ اور شاداب کرے، اور دل کی موتوں کو کھول کر سرچشمہ سے پانی باہر نکالے، جس سے ہماری زندگی سرسبز و شاداب ہو.

خیرِ دائم

غالباً تمام دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ نیکی بلا شبہہ نیک ہے؛ اور اس لئے اس بات کا ماننا بھی لازم آتا ہے کہ ہمیشہ رہنے والی نیکی سب نیکیوں سے افضل و اعلیٰ نیکی ہوگی۔ انسانوں میں نیک وہی ہوگا جس نے بہت سی نیکیاں کی ہوں گی؛ مگر سب سے زیادہ نیک وہی ہوگا، جس نے ایسی نیکیاں کی ہوں جو سب نیکیوں سے افضل و اعلیٰ ہوں۔

بعضوں نے پل اور مسجد، چاہ و مہمان سرائے، چند روزہ رہنے والی چیزوں کو خیرِ دائم سمجھا، اور بہت بڑی غلطی کی؛ کیونکہ یہ تمام چیزیں ادنیٰ حوادث سے فنا اور معدوم ہونے والی ہیں۔ اب کہاں ہے وہ چاہِ یوسف؟ اور کہاں ہے وہ مسجدِ اقصیٰ؟ سب معدوم ہوگئیں اور اسی طرح ہزاروں بنیں گی اور معدوم ہونگیں۔

نہایت فہمیدہ اور دقیقہ رس لوگوں نے خیر و خیرات، زہد و تقویٰ، اور عبادات کو خیرِ دائم خیال کیا؛ مگر اس کی صحت بھی مشتبہ ہے۔ تمام اعمالِ حسنہ آنکھ موندی اور منقطع ہوئے۔ جبکہ انسان موت کے خوابِ راحت میں استراحت فرماتا ہے تو تمام اعمالِ حسنہ کا انقطاع ہو جاتا ہے۔ زاہد کی تسبیح ہمہ تن دانۂ اشک بن کر روتی ہے کہ وہ کیا ہوا جو مجھ کو شمار و وظائف سے زندہ رکھتا تھا؟ مصلّےٰ محرابِ مسجد میں چت پڑا ہائے ہائے کرتا ہے کہ وہ کہاں ہے جو اپنی پیشانی سے مجھ میں جان تازہ بخشتا تھا؟ نیز فراقِ واعظ سے دل شکستہ ہے کہ میرا واعظ کہاں ہے؟ ملائکہ مقربین جو اُس کے ذکر و شغل کی مجلس کی خیر و برکت لینے کو آتے تھے، اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں، اور یہ بکیشتِ خاک؛ ہزاروں من مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں؛ نہ اپنی کچھ کہتے ہیں، اور

نہ کسی کی سنتے ہیں؛ صرف زبانِ حال ان میں باقی ہے، سو وہ یہ کہتی ہے کہ جو ہونا تھا سو ہو لیا، اور جو کرنا تھا سو کر لیا۔

اگر غور سے دیکھا جاوے، اور ٹھیک ٹھیک سمجھا جاوے، تو بجز رفاہ عام اور انسان کی بھلائی چاہنے کے اور کوئی نیکی خیر دائم نہیں ہے۔ انسان کی بھلائی نہ نیکی کرنے والے کی موت سے ختم ہوتی ہے اور نہ اس زمانہ کے انسانوں کے فنا ہونے سے فنا ہوتی ہے؛ بلکہ نسل در نسل اور پشت در پشت آئندہ انسانوں میں چلی آتی ہے، اور قیام دنیا تک دائم رہتی ہے؛ اور اس لئے صرف وہی ایک نیکی ہے جس کو خیر دایم کہہ سکتے ہیں۔

یہی نکتہ تھا جس کے سبب خدا تعالیٰ نے انسان کی بھلائی چاہنے کی خدمت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دی، تا کہ برترین خدا نیک ترین نیکیوں کے منبع اور مخزن ہوں اور خیر دایم ان سے باقی رہے۔ پس انسان کی بھلائی میں سعی کرنا انبیاء کا ورثہ لینا ہے، اور تمام نیکیوں میں سے افضل و اعلیٰ نیکی کا اختیار کرنا۔ پس فلاح عام کے کاموں کو عبادات دینی میں سے نہ سمجھنا، اور صرف نوافل اور مندوبات اور تسبیح اور تہلیل ہی کو عبادت سمجھنا، بہت بڑی غلطی ہے۔

یہ خیر دایم، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا، موجودہ زمانہ میں اور بالتخصیص مسلمانوں کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے۔ میری خواہش مسلمانوں سے یہ ہے کہ وہ تھوڑا سا وقت اور دو چار درم رفاہ و فلاح حال مسلمانوں کے لئے بھی نکالیں، اور خیر دایم کی نیکی کو بھی حاصل کریں کہ صرف یہی ایک نیکی ہے جو ہمیشہ رہے گی۔

وحشیانہ نیکی

انسان وحشیانہ طور پر ایک نیک کام کرتا ہے، اور جو کہ وہ در اصل نیک ہوتا ہے لوگوں کے دل میں بیٹھ جاتا ہے! اور اس وحشیانہ پنے کی بُرائی جس وحشیانہ پن سے یہ کام ہوا، آنکھوں سے چھُپ جاتی ہے. مگر عمدہ تعلیم میں یہ اثر ہے کہ اُن وحشیانہ حرکتوں کو چھڑا دیتی ہے، اور صرف نیکی ہی نیکی رہ جاتی ہے۔

نقل ہے کہ ایک شخص کے پاس دو حبشی لڑکے تھے. ان دونوں میں جانی دوستی اور دلی محبت تھی. اُس شخص کے پاس ایک حبشن نوعمر لڑکی بھی تھی، جو اس قوم میں نہایت ہی خوبصورت سمجھی جاتی تھی. اتفاقاً دونوں جوان لڑکے اُس پر عاشق ہو گئے اور دونوں نے اس کو شادی کا پیغام دیا. وہ لڑکی دونوں میں سے جس کے ساتھ شادی ہو راضی تھی، مگر اس نے کہا کہ تم دونوں دوست آپس میں اس بات کا تصفیہ کر لو کہ دونوں میں سے کس کے ساتھ شادی ہو۔

عشق اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ ایک تو اس سے شادی کرلے، اور دوسرا محروم رہے! اور دوستی بھی ان میں ایسی سچی تھی کہ بغیر آپس کی صلاح اور بغیر آپس کی صلاح اور بغیر آپس کی خوشی کے دونوں میں کسی کو شادی کر لینا پسند نہ تھا. آخرکار عشق اور دوستی میں جھگڑا ہوا! مگر کوئی جیت نہ سکا، دونوں برابر رہے۔

تب وہ دونوں لڑکے اپنی معشوقہ کو ایک دن جنگل میں لے گئے اور دونوں نے اُس کو چھُری مار کر مار ڈالا! اور جب اس کا خون بہنے لگا تو دونوں اُسے چاٹنے لگے. دونوں نے مردہ لاش کو خوب گلے لگایا، اور دلی محبت سے اس کے دلفریب گالوں کا بے گناہ بوسہ لیا، اور پھر اس کی اس کی لاش کے گرد بیٹھ کر رونے اور پیٹنے لگے. خوب

ماتم کیا، خوب چھاتی پیٹی، اور پھر دونوں نے اپنے تئیں بھی مار ڈالا۔

اس عجیب واقعہ سے انسان کے دل کے جوشوں کی، جو تعلیم و تربیت سے شائستہ نہیں ہوئے، عجیب و غریب حالتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جو واقعہ کہ میں نے ابھی بیان کیا، وہ حیرت اور گناہ سے بالکل بھرا ہوا ہے، تو بھی ایسے نیک دل اور دلی ایمانداری سے سرزد ہوا ہے کہ اگر اس کی عمدہ طور سے تعلیم و تربیت ہوتی، تو اس سے نہایت عمدہ عمدہ نتیجے حاصل ہوتے۔

انسان کا ایسے ملک میں پیدا ہونا، یا وہاں جا کر رہنا، اور تعلیم و تربیت پانا، جہاں تعلیم و تربیت کا چرچا ہو، اور علم و شائستگی پھیلی ہوئی ہو، نہایت خوش قسمتی کی بات ہے، گو ان ملکوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ان وحشی لڑکوں سے کچھ بہتر نہیں ہوتے۔

شائستہ ملک کی مثال مورت بنانے والے سنگ تراش کے کارخانے کی سی ہے، کہ جب آدمی وہاں جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ابھی تو کوئی پتھر اسی طرح ڈھوکے کا ڈھوا ہی رکھا ہوا ہے! اور کسی میں ابھی صرف ٹانگیں ہی بنی ہیں! اور کسی میں ہاتھ پاؤں منہ سب کٹ چکا مگر ابھی انگھڑ ہے! اور کسی میں انسان کے تمام اعضا درستی سے بن چکے ہیں، مگر صاف ہونے اور جلا ہونے باقی ہیں! کوئی مورت نہایت خوبصورت اور دلربا بن کر تیار ہو چکی ہے۔ اس وقت انسان کے دل میں ضرور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ پتھر کا ڈھوا کہاں تک ترقی پا سکتا ہے، اور ہر ایک انگھڑ صورت سوائے شاذ و نادر کے، آذر سے بت تراش کے ہاتھ سے نہایت خوبصورت، یا قریب خوبصورت کے ہو سکتی ہے۔

نامہذب ملک کی مثال منڈے پہاڑوں کی سی ہے، جہاں بجز پتھر کے ڈھوکوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کوئی مثال ایسی نظر نہیں آتی، جس سے انسان کو یہ خیال ہو کہ وہ کہاں تک ترقی کر سکتا ہے، اور اس میں کیا چیز نہیں ہے، جو وہ اب تک انگھڑ پتھر کی مانند ہے۔ جو نیکیاں خود اس میں ہیں، ان سے بھی وہ ناواقف ہے، کیونکہ وہ نیکیاں مثل پتھر کے ڈھوکے کے اس جگہ میں چھپی ہوئی ہیں اور بے تعلیم و

تربیت کے وہ ظاہر نہیں ہو سکتیں۔

یہی خیالات مجھ کو اس بات پر برانگیختہ کرتے ہیں کہ میں اپنی قوم کو مہذب قوم سے ملنے، اور شایستہ ملک میں جانے کی ترغیب کرتا ہوں؛ اور اس خیال سے ہمیشہ رنج میں رہتا ہوں کہ ہماری قوم میں جس قدر نیکیاں ہیں، وہ بھی نامہذب ہیں؛ دنیاوی برتاؤ میں آپس کا ملاپ، دوستوں کی دوستی، دینداروں کی دینداری، امیروں کی امیری نہایت ناشایستہ اور نامہذب طور سے واقع ہوئی ہے۔ اگر وہ عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاوے، تو انسان کے لیے اس زندگی میں اور آنے والی زندگی میں دونوں میں نہایت ہی مفید ہو۔

طریقۂ زندگی

قوموں کی عزت یا ذلت، اُن کی رسم و رواج، اور اُن کے طریقۂ زندگی، اور کبھی کبھی ان کے مذہب سے بھی علاقہ رکھتی ہے! تمام قوموں میں بہت سی رسمیں وحشیانہ اور ناتربیت یافتہ زمانہ کی اب تک چلی آتی ہیں۔ مگر تربیت یافتہ قوموں نے ان رسموں کو تراش خراش کر ایسا کر لیا ہے کہ ان میں وحشیانہ پن مطلق نہیں رہا، بلکہ نہایت فرحت بخش اور دلکش ہوگئی ہیں! اور ناتربیت یافتہ قومیں اب تک بدستور وحشیانہ طور سے اُن کو برتتی آتی ہیں! اور اسی لئے پہلی قومیں پچھلی کو ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

اکثر قوموں نے قدیم زمانہ میں طریقۂ زندگی بمقتضائے آب و ہوا ہر ایک ملک کے اختیار کیا تھا، جو اکثر نہایت سادہ و حقارت آمیز تھا۔ مگر تربیت یافتہ قوموں نے اس میں اصلاح کرتے کرتے اعلیٰ درجہ کی ترقی اور شائستگی پر پہنچا دیا! اور ناتربیت یافتہ قومیں اسی جہالت میں پڑی رہیں، اور اس لئے پہلی قوموں کی آنکھ میں ذلیل و خوار ہیں۔

یہ امر بھی بہت واقع ہوا ہے کہ بسبب نہ ہونے فن و ہنر کے ہر ایک قوم نے جو طریقۂ زندگی بسر کرنے کا اختیار کیا تھا وہ اس زمانہ میں حقیر نہ تھا، مگر حال کے زمانہ میں ذلیل ہو گیا ہے۔ چنانچہ جس قدر فن و ہنر اور صنعت کاری نکلتی آئی، اسی قدر تربیت یافتہ قوموں نے ساز و سامان سے اپنے طریقۂ زندگی کو آراستہ کیا! اور جنھوں نے ایسا نہ کیا، وہ ویسے ہی حقیر و ذلیل ناتربیت یافتہ ہیں۔

طریقۂ زندگی سے قوموں کی ذلت اور عزت کا ہونا ایک ایسا امر ہے جس سے کوئی

انکار نہیں کرسکتا۔ مگر ہم چند مثالوں سے اس کو اور زیادہ واضح کرتے ہیں۔ ہندوستان میں کنجروں کی قوم کو دیکھو جو ایک لنگوٹی باندھے رہتی ہے، اور نہایت میلا بدن اور نجس ہاتھ پاؤں رکھتی ہے، اور نہایت میلے بدبودار برتن استعمال میں لاتی ہے۔ غذا بھی ان کی نہایت کثیف ہے اور طرز کھانے کا بھی ایسا بُرا ہے، جسے دیکھ کر گھن آتی ہے۔ پس وہ قوم صرف اپنے طریقۂ زندگی کے ذلیل ہونے کے سبب ہماری آنکھ میں کیسی ذلیل و خوار معلوم ہوتی ہے۔

اب اُن قوموں کو دیکھو جو اُن سے درجہ بدرجہ طریقۂ زندگی کی اصلاح میں ترقی کرتی گئی ہیں، مثلاً چمار جن کا لباس اور طریقِ زندگی کنجروں سے بدرجہا اچھا ہے۔ وہ ہماری آنکھ میں ایسے ذلیل نہیں ہیں۔ چماروں کی بہ نسبت عام غریب گنواروں کا لباس اور طریقۂ زندگی بدرجہا نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔ وہ ہماری آنکھ میں چنداں ذلیل نہیں۔ ہم کبھی اُن کے گھر بھی جاتے ہیں۔ اُن کے یہاں کا پانی بھی پیتے ہیں۔ ان کے گھر کی پکی ہوئی روٹی بھی کھاتے ہیں، اور کچھ نفرت نہیں کرتے۔ علاوہ ان کے، تین قومیں اور ہندوستان میں ہیں جو اپنے تئیں مؤدّب و مہذّب، تربیت یافتہ و شایستہ، سمجھتی ہیں۔

ہندو، مسلمان، انگریز، ان تینوں قوموں کا جو طریقِ لباس، اور طرزِ زندگی اور کھانے پینے کی رسم، اور اُٹھنے بیٹھنے کی عادت ہے، اس سے تمام لوگ ہندوستان کے بخوبی واقف ہیں۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ ان تینوں قوموں میں سے جس قوم کا طریقہ اعلیٰ ہے، وہ قوم باقی دو قوموں کو ایسا ہی ذلیل اور ناتربیت یافتہ اور قابلِ نفرت کے سمجھتی ہے جیسے کہ ہم اپنے سے ادنیٰ قوموں کو سمجھتے ہیں۔

مسلمان اپنی دانست میں اپنے لباس اور اپنی مجلس میں نہایت آراستگی اور شان و شوکت کرتے ہیں، اور اپنے دسترخوانوں کو انواع انواع طرح کے لذیذ کھانوں سے؛ اور خوبصورت خوبصورت سونے اور چاندی اور چینی کے برتنوں سے آراستہ کرتے ہیں۔ مگر جو قوم کہ ان سے بھی زیادہ لباس اور کھانے پینے کے طریق میں زیادہ صفائی

دیکھتی ہے، وہ ان کو اسی حقارت اور ذلت سے دیکھتی ہے۔

جو لوگ کہ چمچے اور کانٹوں سے کھاتے ہیں، اور ہر دفعہ رکابیاں اور چھری، کانٹے، چمچے بدلتے جاتے ہیں، جب وہ ہم مسلمانوں کو ہاتھ سے کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کو نہایت نفرت و کراہت آتی ہے۔

یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہاتھ سے کھانا مسنون ہے، اور اس کو حقیر سمجھنا کفر تک نوبت پہونچا دیتا ہے۔ ہم اس رائے کی صحت و سقم کی بحث سے قطع نظر کر کر اس کو تسلیم کرتے ہیں، اور جو یہ کہتے ہیں کہ ان بزرگوں کی آدھی پیروی کرنا باعث ذلت ہے، اگر مسلمان یہ گوارا کریں کہ مرغن کھانے، جس سے ہاتھ اور منھ بھر جاتا ہے، اور یہی امر باعث نفرت اور گھن آنے کا ہوتا ہے، چھوڑ دیں، اور جو کے بن چھنے آٹے کی سوکھی روٹی، ککڑی یا کھجور سے کھالیا کریں، تو ان بزرگوں کی پوری پیروی ہوگی، اور اس وقت میں کوئی بھی ہاتھ سے کھانے پر نفرت نہ کرے گا۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ کھانے تو ہوویں فرعونی اور طریق کھانے کا ہو مسنونی۔

ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اس نے ہم کو اپنی نعمتیں عطا کی ہیں۔ ہم ان کو استعمال کریں، اور عملی طور پر اس کا شکر بجالاویں، اور جبکہ ہم یہ خیال کریں کہ ان شان کی چیزوں کا ہم بنظر تکبر و غرور استعمال نہیں کرتے، بلکہ بطور ادائے شکر ولی النعم استعمال کرتے ہیں، اور مسلمانوں کی قوم کی غیر قوموں کی نگاہ میں جو ذلت ہے، اس سے نکالتے ہیں جس میں اسلام کی بھی عزت ہے، تو اس وقت تو ہم چمچہ اور چھری کانٹے سے کھانا مندوبات اور مستحبات سے کم نہیں سمجھتے۔

طریق تناولِ طعام

ضد اور نفسانیت انسان کے بہت بڑے دشمن ہیں۔ کسی اچھی بات کو ضد سے نہ ماننا، اور اس کی نیک و بد پر غور نہ کرنا، درحقیقت انسان کا کام نہیں ہے۔

اس وقت نہ ہم کو انگریزوں کی طرح چھری کانٹے سے میز کرسی لگا کر کھانے سے بحث ہے، اور نہ ہم کو ترکوں کی تقلید کی ہوس ہے؛ بلکہ ہم کو نہایت سیدھی طرح سے کھانے کے طریق پر غور کرنی ہے، اور بلا تبدیل وضع جس قدر کہ اس کے نقصان رفع ہو سکتے ہیں، اسی پر بحث کرنے سے غرض ہے۔

ہندو چوکے میں چھوٹی چھوٹی پیالیوں یا تشتریوں یا پتلوں میں تھوڑا تھوڑا سب قسم کا کھانا چن کر آگے رکھ لیتے ہیں؛ اور ہر ایک میں سے کچھ کچھ کھاتے جاتے ہیں؛ اور جو بچتا ہے، وہ اسی برتن میں دھرا رہتا ہے، جس میں انہوں نے کھایا تھا؛ اور اس سبب سے کھانے کے وقت ان کے سامنے جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا سب دھرا رہتا ہے، اور کھا چکنے کے بعد وہ سب اٹھ جاتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا بھی یہی طریق ہے جو ہندوؤں کا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں، مسلمان دسترخوان بچھا کر بیٹھتے ہیں؛ جس طرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی قابوں اور رکابیوں اور غوریوں اور تشتریوں اور پیالیوں میں سب طرح کا کھانا اور سب قسم کی روٹی، اور ہر طرح کے کباب اور فیرنی کے خوانچے اور بورانی کے پیالے، اور اچار مربہ کی پیالیاں، سیتلا کے پوجاپے کی طرح سب اپنے آگے رکھ لیتے ہیں۔

اور اس ایک دستر خوان پر کوئی تو فیرنی کلمۂ شہادت کی انگلی سے اور کوئی بخیر چاروں انگلیوں سے چاٹ رہا ہے؛ کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن ملا ملا کر کھا رہا ہے؛ کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر، نان آبی سے لتھڑا ہوا پنجۂ مبارک پونچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے؛ کسی نے بورانی کے پیالے کو منھ سے لگا، سڑپا بھرا اور یہ کہہ کر "واللہ بڑی تیز ہے۔ اوہ! اوہ!!" کرنا شروع کیا ہے۔ تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا، اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں، اور روٹی کے ٹکڑے، اور سالن میں کی نکالی ہوئی مکھیاں، سب آگے رکھی ہوئی ہیں۔

اس عرصہ میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اس نے ہاتھ دھونا، کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا، اور بیسن سے دانت رگڑنے، اور زبان پر دو انگلیاں رگڑ رگڑ کر زبان صاف کرنا شروع کیا ہے؛ اور آور بے تکلف بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں۔ نہ ان ہاتھ منہ دھونے والوں کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکات ناشایستہ کرتے ہیں، اور نہ کھانا کھانے والوں کو ان لوگوں کی کہ یہہ آواز سُننے، اور زرد زرد ہلدی کے ملے ہوئے رنگ کا لُعاب نکلنے، اور بلغم کے لوتھڑے تھوہ کر کے چلمچی یا تاش میں تھوک دینے، اور بتاسے کی طرح اس کے پانی پر تیرتے پھرنے کی پروا ہے۔ نعوذ باللہ منہا

انگریز جس طرح کھانا کھاتے ہیں وہ سب پر روشن ہے۔ عرب میں کھانا کھانے کا یہ دستور ہے کہ ایک چوکی پر چھوٹا سا خوان بچھایا جاتا ہے، اور ایک برتن میں ایک قسم کا کھانا آتا ہے؛ اور جو لوگ کہ چوکی کے گرد بیٹھتے ہیں، وہ سب اس میں کھانا شروع کرتے ہیں۔ چند لقمے کھانے پر وہ برتن اُٹھ جاتا ہے؛ اور دوسری قسم کا کھانا، دوسرے میں آتا ہے، اور چند لقمہ کے بعد وہ بھی اُٹھ جاتا ہے؛ اور اسی طرح آتا جاتا رہتا ہے۔ اس طرح پر کھانے میں یہ فائدہ ہے کہ جھوٹے برتن اور جھوٹا کھانا سامنے نہیں رہتا۔

مگر جو گھنوناپن ہندوستان کے مسلمانوں میں، کھانے کی مجلس میں ہوتا ہے،

کسی ملک کے کھانے کی مجلس میں نہیں ہوتا۔ پس نہایت شرم اور افسوس کی
بات ہے کہ ہم اپنی ضد اور نفسانیت سے اس جنگلے پن میں پڑے رہیں، اور اس کی
درستی اور تہذیب پر متوجہ نہ ہوں۔

ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ میز کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھاؤ؛
یا عرب کی طرح چھوٹی چوکی پر ایک خوان بچھاؤ، بلکہ شوق سے بسم اللہ دستر خوان پر
کھانا تناول فرماؤ؛ اور گو بہت سی سنن ہدیٰ کے ادا کی فکر نہ ہو، زمین پر
بیٹھ کر کھانا کھانے ہی کی سنت عادی کی پیروی کرو، مگر برائے خدا یہ جنگلا پن چھوڑو؛
اور سب طرح وضع پر کھانا کھانے میں جہاں تک اصلاح و صفائی ہوسکے، اس کو اختیار
کرو۔ صفائی و پاکیزگی اختیار کرنا تو شریعت میں ممنوع نہیں ہے۔

مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب تک کسی کام کے لئے کوئی قاعدہ اور طریقہ نہیں
ہوتا، اور بخوبی اس کی پابندی نہیں کی جاتی، اس وقت تک وہ چلتا نہیں۔
اور جب وہ قاعدہ عمدہ ہوتا ہے، تو رفتہ رفتہ از خود اس کا رواج ہو جاتا ہے،
اور سب لوگ اس کو کرنے لگتے ہیں، اور چند عرصے بعد اسی کی ایسی عادت ہو جاتی
ہے کہ طبیعت ثانی گنی جاتی ہے۔

پس ہمارا مقصد یہ ہے کہ طریقہ تناول طعام کے کچھ قواعد سوچے جاویں۔
اور یہی طریقہ جو دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا ہے، اسی میں ایسی اصلاح کی
جاوے جس کو لوگ موردِ طعن "من تشبہ بقوم" بھی نہ کریں، اور اس جنگلے پنے
سے نجات پاویں۔

رسم و رواج

رسم اس کام کا نام ہے، جو ہمارے بزرگوں سے ہوتا چلا آیا ہے، گو کہ اب ہم کو یہ بھی نہ معلوم رہا ہو کہ وہ کیوں ہوتا تھا، اور اس سے کیا فائدہ ہے؟ رواج اس کام کا نام ہے جس کو سب لوگ کرتے ہوں، یا کرنے لگیں؛ اور اس کے کرنے کو لوگ کچھ عیب نہ سمجھیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ ایک زمانہ میں کوئی کام عیب گنا جاتا ہو، مگر جب وہ رواج پا جائے، تو لوگوں کی آنکھ میں کچھ عیب نہ رہے۔

انگریز مصنفوں نے رسم کی تعریف زیادہ وضاحت سے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک کام کا ہمیشہ بار بار کرتے رہنا، یا کسی کام پر مدتوں سے بطور قانون کے عملدرآمد چلا آنا، رسم کہلاتا ہے۔ رسم ہمیشہ ایک ان لکھا ہوا قانون ہوتا ہے، جس پر سب لوگ مدت سے اتفاق کرتے چلے آتے ہیں؛ اور اس لئے، وہ رسم بطور ایک قانون کے سند ہو جاتی ہے۔

سر والٹر ریلے نے بہت عمدہ بات کہی ہے، کہ رسم و رواج میں وہ فرق ہے جو سبب اور نتیجہ میں ہے؛ کیونکہ جب کسی کام کا رواج مدت تک رہتا ہے تو وہ بطور ایک قانون کے لوگوں میں پھیل جاتا ہے، اور آخر کو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ایک رسم بن جاتی ہے۔

عادت میں اور رسم میں ایک نہایت باریک تفاوت ہے۔ عادت خود ہماری طبیعت کا ایک اصول ہے؛ جو خود ہم میں سے پیدا ہوا ہے، اور جو بالطبع اور بے تکلف ہم کو کسی کام کے بار بار کرنے کو کہتا ہے؛ رسم ایک ایسا اصول

ہے جو باہر سے ہم میں آیا ہے، جس کے سبب سے ہم کسی کام کو بار بار کرتے ہیں۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے مدد ملتی ہے، مثلاً خیرات و زکوٰۃ دینے کی رسم سے فیاضی کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

لفظ 'رسم' کا عام قانون میں بھی آتا ہے؛ اور مقننّ اس کے معنی یہ بتلاتے ہیں کہ:

"رسم ایک ایسا قانون ہے، جو کبھی تحریر میں نہیں آیا، مگر مدتوں سے اور عام لوگوں کی رضامندی سے جاری ہے۔"

رسم و رواج ایک بڑا حصہ ملکی قوانین کا ہوتا ہے، اور اس کا وجود ہر ایک ملک اور ہر ایک عملداری میں پایا جاتا ہے۔ انگلستان میں جو قوانین کہ "کامن لا" کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں وہی بن لکھے قوانین ملکی رسم و رواج کے ہیں۔ بڑے بڑے قانون دانوں نے "کامن لا" کے یہی معنی بیان کیے ہیں کہ "انگلستان کا قدیمی رواجی قانون۔" پس ہمارے ہندوستان میں جو رسم و رواج ہے، وہ ہمارے ملک کا "کامن لا" ہے۔

تمام مقننّوں کی رائے ہے کہ "کامن لا" یعنی رواجی قانون ایسا ہو جو تحریر میں نہ آیا ہو، اور اس کے قاعدے زبانی روایتوں پر چلے آتے ہوں۔ مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ "کامن لا" کے لئے کچھ تحریری کتابیں نہیں ہوتیں، بلکہ "کامن لا" پر نہایت بڑی بڑی کتابیں بہت بڑے لائق اور قابل اور واقف کار عالموں نے لکھی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ "کامن لا" پہلے جاری ہوتا ہے اور پھیل جاتا ہے، اور اس کے بعد وہ ضبط تحریر میں آتا ہے؛ یا، اس پر کتابیں لکھی جاتی ہیں؛ اور تحریری قانون اول تحریر میں آتا ہے، اور اس کے بعد جاری ہوتا ہے اور پھیلتا ہے۔

میری رائے ہے کہ مذہب بھی رسم و رواج پیدا ہو جانے کا ایک سبب ہوتا ہے۔ مگر جب تک کہ اس کے مسائل بطور رسم کے جاری نہ ہو جاویں، رسم و

رواج سے زیادہ قوت نہیں رکھتا۔ اکثر قوموں میں، بلکہ دنیا کی کُل قوموں میں، بہت سی ایسی رسمیں پائی جاویں گی، جو در حقیقت ان کے مذہب کے برخلاف ہیں؛ مگر ان رسموں نے اُن کے دلوں میں ایسی مضبوط جڑ پکڑلی ہے کہ مذہب کی نہایت زبردست اور طاقتور کَل بھی اُس کے اُکھاڑنے سے عاجز ہو گئی ہے۔

رسم و رواج کی حکومت انسانوں کے دلوں پر نہایت قوی اور سب سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ ہر شخص غلام سے بھی زیادہ اس کی تابعداری کرتا ہے۔ آقا کو اپنے غلام پر کبھی کبھی نافرمانی کا اندیشہ ہوتا ہے، مگر رسم و رواج کو اپنے غلاموں کی نسبت نافرمانی کا کبھی اندیشہ نہیں ہوتا۔

تعجب یہ ہے کہ جاہل اور عالم، نادان اور عقلمند، سب برابر اسکی غلامی کرتے ہیں۔ اچھا قابل اور لائق آدمی جو فلاسفی اور حکمت کے باریک باریک مسئلے حل کرتا ہے، جب ان باتوں تک پہونچتا ہے، جن کا رسم و رواج مدّت سے چلا آتا ہے، تو تمام اپنی قابلیت اور عقل و تمیز کو بھول جاتا ہے، اور محض نادان شخص کی مانند اس کے آگے سر جھکا لیتا ہے۔ کسقدر ہم کو تعجب آتا ہے، جبکہ ہم یہ دیکھتے کہ سقراط سا شخص، جس نے اپنی قوم کے ریفارم کرنے میں اپنی جان دی، جبکہ زہر کے پیالہ کا اپنی جان پر اثر پاتا ہے، اور اپنی زندگی کو چند لمحہ سے زیادہ نہیں سمجھتا، اس وقت اپنے پیارے دوست کریٹو کو وصیّت کرتا ہے کہ وہ اس کی منّت کو جو اس کو "ایسکیو لیپی اُس" دیوتا پر مرغی چڑھانے کی تھی، پوری کرے۔

اس واقعہ سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ رسم و رواج کا انسان کے دلوں پر اور سقراط کے سے دل پر بھی، جس کے دل کو گویا خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، کیسا کچھ قوی اثر ہوتا ہے۔ ہاں یہ بات بلاشبہہ تسلیم کرنے کے لائق ہے کہ جو رسم مذہبی سند پر یا مذہبی خیال پر قائم ہوتی ہے، اس کا اثر انسانوں کے دلوں پر، بہ نسبت ان رسموں کے جو اور طرح پر قائم ہوتی ہوں، بہت زیادہ سخت اور نہایت قوی ہوتا ہے۔

اس میرے بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسم و رواج کا تعلق مذہب اور حکومت اور معاشرت سب سے برابر ہے۔ مگر میں اس بات سے کچھ بحث نہیں کرنے کا کہ جو رسمیں دنیا کی قوموں میں جاری ہیں ان میں کونسی اچھی اور کونسی بری ہیں؛ بلکہ میں اس بات پر بحث کروں گا کہ رسومات معینہ میں، خواہ وہ مذہب سے علاقہ رکھتی ہوں یا حکومت و معاشرت سے، اصلاح و ترقی کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو وہ کیوں کر ہو سکتی ہے؟

جو لوگ کہ مذہبی رسومات کے پابند ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی رسمیں سچائی اور انسان کی بھلائی کے لئے نہایت اعلیٰ درجۂ کمال پر ہیں، اور ان سے زیادہ ترقی کرنا ممکن نہیں۔ یہاں تک، کہ اگر کوئی شخص ان میں ترقی، یا اصلاح کرنی چاہئے، (گو کہ وہ اسی مذہب کی سند پر کرتا ہو، جس مذہب کی وہ رسمیں ہیں) تو اس کو کافر اور مذہب سے خارج قرار دیں گے۔ اس کا ٹھکانا بجز جہنم کے اور کہیں نہیں بتلاویں گے۔ مگر ہماری تسلی کو صرف یہی بات کافی نہیں ہے؛ کیونکہ اب تک ایک نہایت ضروری بات پر خیال نہیں کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان رسومات مذہبی کا اثر ہمارے دل پر درحقیقت ان کی سچائی کا سبب ہے، یا ہماری عادت کا، جس کی ہم کو اپنے بچپن سے عادت پڑ گئی ہے۔

رسم جو حکومت سے متعلق ہے، اس پر پابند رہنے کے لئے بڑے بڑے مشہور مقنن اور عالم طرفدار ہیں۔ ٹیسی ٹس رومی مورّخ کا قول ہے کہ:

"جس سلطنت میں زیادہ قانون ہوتے ہیں، اس میں اتنی ہی زیادہ برائی ہوتی ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ غالباً میرے ملک کے لوگوں کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ہندوستان قانون کے بوجھ کے تلے دبتا چلا جاتا ہے؛ اور اسی سبب سے، اس میں روز بروز پیچیدہ حالات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

رسم و رواج کے طرفداروں کے لئے رومیوں کی حکومت ایک بہت بڑی مثال

گنی جاتی ہے، جن کی حکومت میں تمام کام خواہ وہ عام لوگوں سے متعلق ہوتے تھے، خواہ لوگوں کے ذاتی کاموں سے؛ خواہ عدالت کے فیصلوں سے، باپ دادا کی رسم پر مبنی ہوتے تھے. یہاں تک کہ مجرموں کو سزا دینے وقت جس طرح کہ ہم پینل کوڈ کی دفعہ کا حوالہ دیکر سزا دیتے ہیں، وہ اپنے باپ دادا کی رسم کا حوالہ دے کر سزا دیتے تھے. سیاسٹ رومی مورخ لکھتا ہے کہ ٹاڈ کوئینٹ کو جلاوطن کرنے کے حکم میں یہ لکھا گیا تھا کہ:

"ایک رسم کی تبدیلی کے سبب جلاوطن کیا گیا."

ورجل مصنف بھی رسم و رواج کا طرفدار ہے؛ اور کرسے سسٹم کا قول ہے کہ:

"وہ قوم غلامی کی حالت میں ہے، جس پر قانون حکومت کرتا ہے؛ اور آزاد قوم وہ ہے، جس پر رسم و رواج کی حکومت ہوتی ہے."

گولڈ اسمتھ لکھتا ہے کہ:

"رسم و رواج، درحقیقت اپنے باپ دادا کے حکموں کو ورثہ کے طور پر لینا ہے، جس پر خود ہی لوگ چلتے ہیں اور نہایت خوشی اور رضامندی سے انکو مانتے ہیں؛ اس لئے ملکی رسم و رواج کا جاری رہنا قومی آزادی کا نشان ہے؛ اور چونکہ یہ رسمیں اس ملک کے معزز و قابل ادب بزرگوں سے چلی آتی ہیں، اسلئے ان سے آئندہ کو بھی قومی آزادی کے محفوظ رہنے کو بڑی مدد ملتی ہے. شاید یہی سبب تھا جو رومن ریپبلکن رسم و رواج کی نہایت عزت کرتے تھے، اور نئے قوانین کے جاری کرنے میں نہایت تامل کرتے تھے؛ اور اسی سبب سے ان کی سلطنت بہت دنوں تک رہی اور تمام دنیا میں بے انتہا نیکیوں کا نمونہ ہوئی. قوانین کا فائدہ ان کے ماننے اور ان پر عمل کرنے پر منحصر ہے. پس رسم و رواج کے قانون ان کے بانیوں کی عزت کے سبب از خود معزز ہوتے ہیں، اور تمام لوگ ان کے بانیوں کی نیکی اور انتظام کی نقل کرنے میں ہمیشہ

مشغول رہتے ہیں۔ اسی سبب سے رومی لوگ اپنے باپ دادا کی یادگاری مذہبی طور پر کیا کرتے تھے، اور مدتوں تک اسی طرح عملدرآمد کرنے سے انکے ہاں کی معزز اور قابل ادب رسموں کی گردن پر نئے نئے قوانین کی موٹی موٹی اور بھاری بھاری جلدیں سوار نہیں ہوئی تھیں۔ قومی رسموں نے بسبب اپنے پرانے اور سیدھے سادے اور مختصر ہونے کے ایک نہایت بزرگ اور ہمیشہ قائم رہنے والی صورت پیدا کرلی ہے، جس کے دلوں میں بڑی عزت بیٹھ گئی ہے۔ مگر نئے قوانین جو بڑی بڑی جلدوں میں لکھے جاتے ہیں وہ لوگوں کو گھبرا دیتے ہیں، اور ہمیشہ اَدل بَدل ہوتے رہتے ہیں؛ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ان کو بھول جاتے ہیں اور ان کو حقیر سمجھتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ جو کام انسان کرتا ہے، اُس میں ضرور بڑی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں؛ اور اس لیے ضرور ہے کہ ان قانونوں میں بھی کچھ غلطیاں ہوں، اور پھر وہ غلطیاں اور نقصان جلد معلوم بھی ہو جاتے ہیں، اور ایک جزو میں نقصان ثابت ہونے سے تمام قوانین حقارت کے قابل ہو جاتے ہیں۔ رسومات، جو قدیم سے چلی آتی ہیں، شاید ان میں بھی کچھ نقصان ہوں، مگر لوگ ان نقصانوں پر کچھ لحاظ نہیں کرتے؛ بلکہ ان کی حمایت میں ایک دوستانہ تعصب برتتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک قانون نہایت انصاف سے بھرا ہوا ہے، اور ضروری بھی ہے، اور اس کے برخلاف کوئی دلیل بھی نہیں ہے، تو بھی لوگ اس قانون کی عزت نہیں کرتے۔ مگر رسم و رواج کے برتنے میں وہ بالکل اندھے ہو جاتے ہیں، اور اس کی غلطیوں کو خود دیکھتے اور سمجھتے ہیں، اور کچھ نہیں کہتے؛ بلکہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے عقلمند اور دور اندیش باپ دادوں نے جو کچھ کیا ہے، وہ کچھ سمجھ کر کیا ہے، اور کوئی نہ کوئی اس کا سبب ہوگا! اگرچہ اب ہم اس کا سبب نہیں جانتے، مگر جو فائدے کہ اُس رسم کے مقرر کرنے سے تھے، اس رسم کے کرتے رہنے سے برابر ہم

کو ملتے رہتے ہیں، گو کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا فائدے تھے اور کیوں کر ہم کو ملتے ہیں۔"

یہ وہ دلیلیں ہیں جو رسم و رواج کے طرفداروں نے نہایت مضبوط مضبوط سمجھ کر پیش کی ہیں۔

یہ نہ سمجھنا کہ ان کی مخالفت کسی نے نہیں کی ہے۔ مانٹیسکو کے مشہور رومی مصنف اس رائے کے بالکل برخلاف ہے۔ اس کا قول ہے کہ:

"جس قوم میں جسقدر زیادہ تحریری قانون ہوتے ہیں، وہ اتنی ہی زیادہ آزاد ہوتی ہے۔"

بعضوں کا قول ہے کہ:

"اس سے زیادہ کون ملک نفرت اور حقارت کے قابل ہے، جہاں کی حکومت صرف وہاں کے رسم و رواج کے مطابق ہوتی ہے، اور کوئی تحریری عمدہ قانون جاری نہیں ہے، اور گورنمنٹ اور اس کی رعایا کے حقوق کی کوئی حد بھی معین نہیں ہے۔"

میں بھی رسم و رواج کی پابندی کا طرفدار نہیں ہوں۔

کوئی قوم، بلکہ کوئی خاندان، ایسا نہیں ہے جس میں درباب معاشرت ہزارہا اور عجیب عجیب رسمیں جاری نہوں؛ یہاں تک کہ سویلائزڈ ممالک میں بھی ہزاروں لغو رسمیں جاری ہیں: جبکہ انسانوں کے مزاج میں وحشت کم ہوئی، اور جانوروں کی طرح جنگل میں رہنے اور خانہ بدوش پڑے پھرنے اور جانوروں کے شکار سے پیٹ بھر لینے، اور اُنہیں کی کھال پہن لینے کے بدلے انہوں نے تمدن اختیار کیا، اور آپس میں مل جُل کر رہنے لگے، اور معاشرت کی حالت پیدا ہونے لگی، اُسی کے ساتھ رسم و رواج نے بھی ظہور پایا۔ گویا تمدن و معاشرت، رسم و رواج پیدا ہونے کا سبب ہے، اور پچھلا پہلے کا نتیجہ ہے۔ مگر اُن کے قائم ہونے کے اور بھی سبب ہوئے ہیں: ملک کی خاصیت؛ مختلف ملکوں کے لوگوں کی مختلف ضرورت؛ قوموں کی طبیعتوں

کا اختلاف؛ ان کے مزاجوں کا تفاوت، جسکو انگریزی میں "ٹیسٹ" کہتے ہیں؛ ان کے اعضاء کی خصوصاً دماغ کی بناوٹ، جس سے اعلیٰ یا ادنیٰ درجہ کی طبعی خیالات پیدا ہوتے ہیں، اور بالاخیر کو علم و ہنر کی ترقی.

رسم و رواج کا تبدیل کرنا، اور اُن کو ترقی دینا انسانی سوسائٹی کے لئے ایسا ہی ضرور ہے جیسا کہ ہر انسان کو زندگی قائم رکھنے کے لئے سانس لینا، اور متغیر ہوا کو نکالنا، اور تازہ حیات بخش ہوا کو اندر کھینچنا. اگرچہ ہر ایک شخص سمجھتا ہے کہ ہمارے رسم و رواج میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے، لیکن جبکہ ان سببوں پر خیال کیا جاوے، جو کہ رسم و رواج کے قائم ہونے کے سبب ہیں، اور جن کو مینے ابھی بیان کیا ہے، تو معلوم ہوگا کہ وہ سبب ہی شاید، سوائے بعض کے، ایسے ہیں جن میں ہمیشہ تغیر و تبدیلی ہوتی رہتی ہے؛ اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ سبب زمانہ کے گزرنے پر ترقی پاتے جاتے ہیں. پس ضرور ہے کہ ان کے نتیجوں یعنی رسموں میں بھی تبدیلی اور ترقی ہو. یہ دعوے منطقی شکل پر اس طرح قائم ہوتا ہے کہ:

رسمیں نتیجہ ہیں زمانہ کی حالت کا، اور زمانہ کی حالت ہمیشہ قابل تغیر ہے،

پس رسمیں بھی قابلِ تغیر ہیں.

یہ خیال کہ ہماری رسموں میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے (گو وہ کیسے ہی مضبوط یقین سے دل میں بیٹھا ہو) بھروسے اور اعتماد کے لائق نہیں ہے؛ کیونکہ ممکن ہے کہ صرف عادت نے یہ خیال ہمارے دل میں جمایا ہو. اس بات کا اندازہ کرنا کہ انسان، جن عادتوں میں ابتداء سے پرورش پاتا ہے، اور پلتا ہے، اور بڑھتا ہے، وہ کہاں تک اس میں اثر کر جاتی ہیں، اور دوسری طبیعت سی ہو جاتی ہیں، حقیقت میں انسان کی طاقت سے بھی بہت زیادہ اور بلند درجہ پر ہے. چنانچہ مختلف قوموں کی مختلف رسموں پر لحاظ کرنے سے اس بات کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے.

رسومات میں اصلاح کی ضرورت خود انسان کے حالات پر غور کرنے سے ثابت ہوتی ہے. جبکہ ہم انسانوں کی سوسائٹیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی رسمیں، کیا

مذہب کی، اور کیا حکومت کی، اور کیا معاشرت کی، مختلف پاتے ہیں۔ مختلف کا لفظ شاید میںنے غلط کہا ! کیونکہ مجھ کو یوں کہنا چاہیئے، کہ ایک کی رسم کو دوسرے کی رسم کے برعکس یعنی نقیض پاتے ہیں ! اور کیونکہ دو نقیضین کبھی صحیح نہیں ہو سکیں، اس لیئے دونوں کی دونوں رسمیں بھی اچھی نہیں ہو سکتیں۔ پس رسومات متناقضہ کا موجود ہونا ہی کافی ثبوت اس بات کا ہے کہ رسومات کا توڑنا اور تبدیل کرنا اور ترقی دینا نہایت ضرور ہے۔

اس بات کے ثبوت کے لیئے کہ مختلف قوموں میں تینوں قسم کی متناقض رسومات موجود ہیں، ان قوموں کی رسومات پر جو مذہب، حکومت اور معاشرت سے متعلق ہیں، غور کرنی کافی ہے۔

دیکھو، اگلے زمانہ کے یونانیوں اور مصریوں اور ہندوستان کے ہندوؤں کو، جو مذہبی رسومات میں بیسیوں دیوتاؤں کو ماننا اور ان کی پرستش بجالانا، اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں ! مگر یہودی اور مسلمان : ٹھیک اس کے برخلاف ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سوائے ایک خدا کے کسی دوسرے کی پرستش کرنا ٹھیک جہنم میں جانا ہے۔

یہودی اور مسلمان، اور ہندو جگ کے وقت، اپنی نجات کے لیئے قربانیاں کرتے ہیں۔ مگر ایک بودھ مذہب کا پیرو اس کو بہت بڑی ہتیا اور سخت عذاب کا کام سمجھتا ہے۔

ہندو اور رومن کیتھلک عیسائی اپنے پیشواؤں کی مورتوں کے سامنے پرستش کرنا کسقدر روحانی خوشیوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں ! مگر یہودی اور پروٹسٹنٹ عیسائی اور مسلمان اس کو روحانی موت کا سبب خیال کرتے ہیں۔ ایک نہایت نیک دل ہندو نہایت سچائی اور دلی اعتقاد سے اور بیکنٹھ میں جانے کے یقین سے ایک دیوتا کی مورت پر اپنی جان کی آپ قربانی کرتا ہے ! مگر عرب کے ریگستان کا قانون بنانے والا ایسے فعل کو خود کشی قرار دیتا ہے، اور اس کے کرنے والے کو نرک میں ڈالتا ہے۔

ایک ہندو اپنے پیارے باپ کی لاش کو کس محبت اور عزت اور نیکی اور ابدی نجات کے یقین سے نہایت خوفناک اور تیز بھڑکتی ہوئی آگ میں جلاتا ہے، اور پھر اس کی جلی مٹی سے، اس کی ہڈیوں کو چنتا ہے، اور ان کا نام "پھول" رکھتا ہے، اور پھر گنگا میں بہاتا ہے؛ مگر ایک یہودی، یا عیسائی یا مسلمان اس کو نہایت بے رحمی اور سنگدلی کا کام سمجھتا ہے۔ وہ کسی مجرم کی لاش کو بھی آگ میں ڈالنا سخت گناہ سمجھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں بھی نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اپنے عزیز کی لاش کو خود اپنے ہاتھوں، جلتی آگ میں ڈال دیا جائے۔ پس یہ بات غور کے قابل ہے کہ مذہبی رسومات بھی ایک قوم کی دوسری قوم سے کیسی مختلف ہیں۔

رسومات جو حکومت سے متعلق ہیں، وہ بھی باہمی اختلاف رسومات کے اندازے سے مختلف ہیں۔ ایک ٹکڑا امریکہ کا غلاموں کو آزاد کرنا گورنمنٹ کا ایسا ہی فرض سمجھتا ہے جیسا کہ دوسرا ٹکڑا (افریقہ کا) مالکوں کا حق غلاموں پر قائم رکھنا واجب جانتا ہے۔ ہندوستان کی پہلی حکومت میں دختر کشی ایک رسم ناقابل مزاحمت، اور ستی ایک رسم قابل ادب اور تعظیم کے، تصوّر کی جاتی تھی؛ مگر موجودہ حکومت انکو قتل انسان مستلزم سزا کا جرم قرار دیتی ہے۔

معاشرت و تمدّن کی رسومات کے اختلاف کی تو کچھ انتہا ہی نہیں ہے۔ ایک قوم کو دیکھتے ہیں کہ وہ سر ننگا کرنا اور پاؤں میں جوتی پہنے رہنا نہایت تعظیم و ادب کا ادا کرنا سمجھتی ہے؛ مگر میں سُنتا ہوں کہ ہندوؤں میں سر ڈھانکے رہنا اور جوتی اتار کر ننگے پاؤں ہو جانا نہایت درجہ ادب و تعظیم کا کام سمجھا جاتا ہے۔

سب سے بڑا معاملہ معاشرت اور تمدن کا شادی و بیاہ سے متعلق ہے۔ ایک قوم کی خوبصورت نیک لڑکی نہایت پاک مگر محبت کے بھرے ہوئے دل سے اپنے لئے آپ شوہر پسند کرتی ہے؛ مگر ہندوستان کی قوم کی لڑکی بیاہ کے بعد بھی اپنے شوہر سے بات تک نہیں کرتی۔

دیکھو کثرت ازدواج، یعنی ایک سے زیادہ شادی کرنی، ایک قوم میں کسقدر

معیوب اور کیسی قابلِ نفرت قرار پاتی ہے! مگر ہندوستان کی ایک قوم "کولین" میں یہ رسم کیسی عمدہ اور مبارک سمجھی جاتی ہے، ستّر برس کے بڈھے سے ساٹھ برس کی لڑکی کی، جو اُنہترویں جورو اس بڈھے کی ہوتی ہے، شادی کی جاتی ہے، اور شادی کرنے والے اس شادی کو ایک بہت بڑا اُپن اور نہایت ہی عمدہ کام سمجھتے ہیں! اور قوم کے ہندو بھی کثرتِ ازدواج کو معیوب نہیں سمجھتے؛ اور مسلمان بھی چار تک، اور اُن کا ایک فرقہ "کولین" فرقہ سے بھی بڑھ کر لاانتہا تک کثرتِ ازدواج کو معیوب نہیں سمجھتا۔ مگر یورپ کی سوسائٹی میں کثرتِ ازدواج پر مثلِ ایک سنگین جُرم کی سزا دی جاتی ہے۔

آپ زیادہ تر تعجب کریں گے جب کہ آپ اس قوم کی رسم پر غور کریں گے جو کوہستان "سراج کلو" علاقہ کانگڑہ میں آباد ہے، اور جو "کنیت" کہلاتی ہے، اور جن میں یہ رسم ہے کہ چار پانچ بھائیوں میں صرف ایک عورت ہوتی ہے، یعنی وہ سب ملکر ایک عورت سے شادی کرتے ہیں، اور وہ ان سب کی جورو ہوتی ہے۔ جو شوہر خلوت کے مکان میں اس کے پاس جاتا ہے، اپنی لاٹھی، جوتی باہر چھوڑ جاتا ہے، تاکہ دوسرا شوہر ان نشانیوں کو دیکھ کر اُلٹا پھر جاوے۔ اس پہاڑی ملک کو ایک وحشی ملک سمجھ کر حقیر مت سمجھو! اسپارٹا کیسے ملک میں بھی ایک زمانہ میں ایسی ہی رسم تھی۔ وہاں کے مرد بغیر خاص وجہ کے ایک سے زیادہ شادی نہ کر سکتے تھے؛ مگر وہاں کی عورتیں ایک سے زیادہ خصم کرنے کی بلا قید مجاز تھیں، اور کبھی کئی خصم ساتھ رکھتی تھیں۔ جس طرح کہ ہم لوگ ایک عورت کے کئی خصم ہونا معیوب سمجھتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ ایک مرد کی کئی کئی جوروئیں ہونا سخت معیوب اور نہایت ہی عجیب بات خیال کرتے تھے۔

ایک چینی، جن میں دانتوں کا سیاہ کرنا نہایت پیاری رسم ہے، جب یورپ میں جاتا ہے تو تمام لیڈیوں کے سفید اور موتی کے سے آبدار دانت دیکھ کر نہایت متعجب ہوتا ہے؛ اور جب ان کو چلتا پھرتا دیکھتا ہے تو اور بھی تعجب میں پڑ جاتا ہے، کیونکہ چینیوں میں عورتوں کے پاؤں لوہے کے شکنجے میں چڑھا کر ایسے ایسے چھوٹے چھوٹے کر دیتے ہیں کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتیں۔

اگر کوئی اشراف مسلمان خاندان کی عورت عربی گھوڑے پر سوار ہو کر سر بازار نکلے تو کون سا عیب ہے جو اس پر نہ لگایا جاوے ؟ مگر تمام انگلش لیڈیاں مثل مردوں کے باہر پھرتی ہیں۔ کیا آپ لوگ اس رسم کو عجیب اور نہایت ہی عجیب نہ سمجھیں گے کہ میسور کی ایک قوم میں یہ رسم ہے کہ جب کسی عورت کے ہاں اوّل مرتبہ لڑکا پیدا ہوتا ہے، یا بانجھ عورت لڑکے کو متبنیٰ کرتی ہے، تو اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کی ایک ایک پور کٹوا ڈالتی ہے اور اس کو نہایت مبارک سمجھتی ہے۔

یہ چند مثالیں بطور نمونہ کے میں نے آپ کے سامنے بیان کیں، ورنہ بہت سی ایسی رسمیں نکلیں گی کہ جن کو ایک قوم نہایت اچھا اور دوسری نہایت ہی بُرا سمجھتی ہوگی؛ اور چونکہ وہ دونوں رسمیں آپس میں برخلاف ہیں، اس لئے وہ دونوں رسمیں اچھی نہیں ہو سکتیں؛ اُن میں سے ایک اچھی ہوگی اور ایک بُری ہوگی۔ پس، اگر رسموں کی پابندی کیجاوے، تو ضرور کوئی نہ کوئی قوم ایسی رسموں میں جو درحقیقت بُری اور خراب ہیں، مبتلا رہیگی۔

جو لوگ رسموں کی پابندی کے طرفدار ہیں، اُن سے یہ سوال ہوتا ہے کہ جن رسموں کی تم پابندی چاہتے ہو، وہ رسمیں بھی تو بعد اصلاح و ترمیم و تبدیلی کے تمہارے بزرگوں نے قائم کی تھیں، کیونکہ تمہارے بزرگوں کے بزرگ اس سے بھی زیادہ وحشیانہ رسموں میں مبتلا تھے۔ پس جب کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے بزرگوں کی رسموں کو اصلاح کیا ہے، تو ہم اپنے بزرگوں کی رسموں کو جو اصلاح کے قابل ہوں کیوں نہ اصلاح کریں؟

اگر رسموں کی اصلاح کرنا ابتدا سے انسان کی نسلوں میں جاری نہ ہوتا، اور ابتدا سے تمام انسان رسموں کی پابندی کے ایسے ہی طرفدار ہوتے جیسے کہ ٹیسی ٹس، ورجل، گرے سطم اور گولڈ اسمتھ تھے، جن کے اقوال میں نے اوپر بیان کئے، تو آپ جانتے ہیں کہ ہماری تمہاری کیا حالت ہوتی؟ ہم میں سے کسی کے آگے پیچھے، کسی درخت کے دو پتے بندھے ہوتے؛ اور کسی کے، کسی جانور کی بالوں دار کچی کھال لپٹی ہوتی؛ اور عدن کے درختوں کی آڑ میں بیٹھے

ہوئے خدا کے گیت گایا کریں۔ پس جو لوگ رسموں کی اصلاح اور ترقی کے برخلاف ہیں، وہ خود اس میں مبتلا ہیں جس سے لوگوں کو منع کرتے ہیں؛ کیونکہ وہ ایک ترقی یافتہ زمانہ کی رسموں کو پکڑتے ہیں، اور دوسرے ترقی یافتہ زمانہ کی رسموں کو پکڑنے سے انکار کرتے ہیں۔

تمام کام جو رسم کے برخلاف کیے جاتے ہیں، ابتداءً سب کو بُرے معلوم ہوتے ہیں اس کا بڑا سبب بے علمی اور جہالت ہے؛ کیونکہ ان کی بے علمی یا ناقص تعلیم، اُنکی تعلیم کو اس قدر قوت نہیں بخشتی کہ وہ رسومات کے اس تعصب اور جہالت اور رمٹ پر جو عادتاً ان کے دل میں بیٹھی ہوئی ہے، غالب آوے، اور نہایت انصاف سے دیکھے کہ رسومات معینہ میں درحقیقت کیا نقص ہیں، اور اُن کی ترقی اور اس کی اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں۔

رسومات کی اصلاح و ترقی جس طرح کہ انسان کے ظاہری طریقۂ زندگی کو فائدہ دیتی ہے، اسی طرح اس کی عقل کو بھی ترقی دیتی ہے۔ ایک بات کے پیچھے لگے رہنے اور اسی لکیر پر چلے جانے سے انسان کی عقل سو جاتی ہے، اور قوت ایجاد جو خدا نے انسان میں رکھی ہے وہ معطل بلکہ قریب معدوم ہونے کے ہو جاتی ہے؛ اور اس سبب سے قومی تنزل شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ قوت ایجاد ہی کے معطل ہونے سے تمام علوم و فنون میں فتور آجاتا ہے، اور کسی چیز میں ترقی نہیں ہو سکتی؛ یہاں تک کہ جولاہے اور بڑھئی اور لوہار بھی اپنے اپنے پیشہ میں نہ کچھ ترقی کر سکتے ہیں اور نہ کچھ ایجاد کرتے ہیں۔ اور ٹھیک ٹھیک یہی حال ہندوستان کا ہو گیا ہے۔

رسومات کی اصلاح اور ترقی کے وقت بلاشبہ یہ نازک مسئلہ بحث میں آتا ہے کہ کونسی رسم اچھی اور کونسی بُری ہے، اور اس کا جانچنا اور تصفیہ کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ اگر گورنمنٹ دست اندازی کرے تو ہم کو ان بد رسموں کو اپنی قوم سے چھڑانے کا اور سب کو دھکا کر راہ پہ لانے کا موقع ملے۔ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم بدنامی سے محفوظ رہیں، اور گورنمنٹ کو لوگ بدنام کریں۔ جو

لوگ اس سے زیادہ سنجیدہ اور متین اور معقول ہیں، وہ ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ اگر برادری کا اتفاق ہو، اور بزرگ بزرگ لوگ اس کو کرنے لگیں، تو یہ کام چل جاوے. مگر نہ کبھی کسی رسم کے چھوڑنے یا بدلنے پہ اتفاق ہوتا ہے، اور نہ کسی رسم میں اصلاح و ترقی ہوتی ہے، بلکہ اسی تاریکی کی حالت میں زمانہ کا زمانہ گزرا چلا جاتا ہے.

اکثروں کا یہ خیال ہے کہ آپس میں اتفاق ہو تو رسموں میں اصلاح و ترقی ہو. گویا وہ اصلاح و ترقی کو اتفاق پہ منحصر رکھتے ہیں. مگر میں اس رائے سے بالکل مختلف ہوں. میں سمجھتا ہوں کہ رسموں کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے، بلکہ اختلاف ہے. جس شخص کے دل میں اصلاح و ترقی کا خیال ہو اسکو چاہیئے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے، اور اس رسم کو توڑے، یا اس میں اصلاح و ترقی کرے. اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام قوم اس کو بُرا کہے گی اور نکو بنائے گی؛ مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں گے، اور جس طرح کہ وہ اولاً ہدفِ تیرِ ملامت ہوا تھا، انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلح قوم شمار کیا جاوے گا.

جب تک کوئی شخص تمام قوم سے اختلاف کر کر رسم کو نہ توڑے، وہ رسم موقوف ہی نہیں ہو سکتی. پس یہی ایک طریقۂ اختلاف ہے جس سے قوم کی اصلاح و دُرستی ہو سکتی ہے! اور ایسا کرنے والا ہی سچا خیر خواہ اپنی قوم کا متصوّر ہے. پس میں اپنے عزیز ہموطنوں سے کہتا ہوں کہ چھپکے چھپکے اپنے فرقہ کے لوگوں میں بیٹھ کر رسموں کو بُرا کہنا، اور ان کی اصلاح و درستی کے لیۓ ساتھیوں کو ڈھونڈھنا، اور قید سے نکلنے کے لئے قافلہ کی راہ دیکھنا، محض بے فائدہ اور سراپا غلطی ہے. جو شخص بہادر ہے، اور اپنی قوم کا سچا خیر خواہ، اس کو خود اُن بھاری بیڑیوں کو توڑ کر میدان میں آنا چاہیئے، تاکہ لوگوں کو بھی اس قید سے نکلنے کی جرأت و ہمّت ہو.

اگلے اور حال کے زمانہ میں جن لوگوں نے اپنی قوم کی بھلائی چاہی، انھوں نے اسی طریقہ پر عمل کیا ہے. اور آج تک دنیا میں کوئی مثال ایسی نہیں ہے کہ بغیر اس طریقہ

کے، کسی دوسرے طریقہ سے، قومی ترقی اور بد رسومات کی اصلاح ہوئی ہو۔ دیکھو اس زمانہ سے ساڑھے اڑتیس ۳۸۵۰ سو برس پیشتر "کلدانیان" میں ایک جوان تھا، جس کو ابراہیمؑ کہتے تھے۔ اس نے اپنی قوم کو بت پرستی میں پڑا، اور بہت سی بد رسموں میں پھنسا ہوا، دیکھا۔ اس کا دل اپنی قوم کی خراب حالت پر جلا؛ خدا نے اس کی مدد کی؛ وہ اپنی قوم کے برخلاف کھڑا ہوا؛ تمام قوم نے اس کو لعنت ملامت کی، قتل کرنا چاہا، آگ میں ڈالنا چاہا؛ مگر خدا نے اس کو بچایا؛ اور پھر انجام یہ ہوا کہ وہی ابراہیم تمام دنیا کی قوموں کے لیئے رحمت ٹھہرا۔ صلوٰۃ اللّٰہ علیہ و علے آلہٖ

پھر خدا کی اس "قربانی کی بھیڑ" کو دیکھو جس کا اسی کی قوم نے اپنی دانست میں نہایت بے رحمی اور سنگدلی سے 'کالوری' پہاڑی کے نیچے بیت المقدس کے پاس خون بہایا۔ اس بیگناہ کا یہ گناہ تھا کہ اپنی قوم کی رسومات کی برائی کرتا تھا۔ اُن کو بد ذاتی اور ریاکاری سے منع کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ راست بازی نے اس کو نہایت مصیبت میں ڈالا؛ مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ کروڑوں آدمیوں نے اس کو خدا کا اکلوتا بیٹا مانا (نعوذ باللّٰہ منہا)، اور کروڑوں آدمیوں نے اس کو "روح اللّٰہ" اور "کلمۃ اللّٰہ" جانا۔

دیکھو ریگستان عرب کے ہادی کو، جس نے اپنی قوم کو "لات و منات و عزّےٰ" کی پرستش سے چھوٹایا، اور اولاد کے قتل سے بچایا۔ گو کہ اسی کی قوم نے اس کو ستایا، اور وطن سے نکالا، مگر انجام کو خدا کا آخری پیغمبر مانا، اور اسی کی بدولت سب نے خدائے واحد کو پہچانا۔ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم

سُقراط کا واقعہ بھی کچھ کم عبرت انگیز نہیں ہے۔ اس نے اپنی قوم کی بھلائی پر کمر باندھی، انکی بد رسموں کی اصلاح چاہی؛ مگر اسی کی قوم نے اس پر دیوتاؤں کے بُرا کہنے اور ایتھنز کے نوجوان لڑکوں کے بہکانے کا الزام لگایا، یہاں تک کہ زہر کے پیالے سے اُسکو مارا۔ مگر چند روز بھی نہیں گزرے تھے، کہ تمام ایتھنز کے رہنے والوں نے اس کا ماتم کیا اور تمام دیوتاؤں سے اس کو بڑا دیوتا مانا۔

امام حجۃ الاسلام غزالی کا نام لیئے بغیر میں اس فہرست کو ختم نہیں کر سکتا، جنہوں نے

اسرار مسائل اسلام کے بیان کرنے میں تا بمقدور اپنی سعی اور کوشش کی۔ اگرچہ بڑے بڑے متعصب مولویوں نے اس کے کفر کے فتوے دیئے، اور اس کی کتاب احیاء علوم الدین کے جلانے کا حکم دیا، اور اس کے قتل کے عام احکام جاری ہوئے، مگر انجام کار وہی غزالی امام حجۃ الاسلام کے لقب سے پکارا گیا۔

اس زمانہ میں جو واقعات گزرتے ہیں، اور جن کو اکثر لوگوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہوگا، وہ بھی یہی ہیں کہ جس شخص نے رسومات بد کی اصلاح چاہی، فی الفور اس نے اپنی قوم سے مخالفت لی، اور رفتہ رفتہ لوگ اس کے ساتھی ہوتے گئے۔

بہت سے لوگوں کو تم دیکھو گے کہ ہزاروں رسموں کو فضول اور لغو سمجھتے ہیں، اور کچھ بھی اس میں یقین نہیں رکھتے، پر کرتے ہیں؛ اور بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کے بے نقص ہونے پر یقین کرتے ہیں، پر کرتے نہیں۔ ایسی باتوں سے کچھ قوم کی بھلائی نہیں ہو سکتی، بلکہ میری سمجھ میں یہ بھی ایک قسم کی دغابازی ہے۔

میری نصیحت تم کو یہ ہے کہ:

"کرو اس کو جس پر تم کو دلی یقین ہے؛ اور مت کرو اس کو جس پر تم کو دلی یقین نہیں!"

یہی اصلی سچائی ہے اور یہی ایک بات ہے، جس پر دونوں جہان کی نیکی منحصر ہے۔

خدا تمہارے نیک کاموں میں تمہاری مدد کرے!

جو لوگ کہ حسن معاشرت، اور تہذیب اخلاق، و شائستگی عادات پر بحث کرتے ہیں، ان کے لئے کسی ملک یا قوم کے کسی رسم و رواج کو اچھا، اور کسی کو برا ٹھہرانا نہایت مشکل کام ہے۔ ہر ایک قوم اپنے ملک کے رسم و رواج کو پسند کرتی ہے، اور اسی میں خوش رہتی ہے؛ کیونکہ جن باتوں کی بچپن سے عادت و موانست ہو جاتی ہے، وہی دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں؛ لیکن اگر ہم اسی پر اکتفا کریں، تو اس کے معنی یہ ہو جاویں گے کہ بھلائی اور برائی حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ صرف عادت پر موقوف ہے۔

جس چیز کا رواج ہوگیا، عادت پڑ گئی، وہی اچھی ہے؛ اور جس کا رواج نہ ہوا، اور عادت نہ پڑی، وہی بُری ہے۔

مگر یہ بات صحیح نہیں۔ بھلائی اور بُرائی فی نفسہ مستقل چیز ہے۔ رسم و رواج سے البتہ یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کوئی اس کے کرنے پر نام نہیں دھرتا، عیب نہیں لگاتا، کیونکہ سب کے سب اس کو کرتے ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے وہ چیز اگر فی نفسہ بُری ہے، تو اچھی نہیں ہوجاتی۔ پس ہم کو صرف اپنے ملک یا اپنی قوم کی رسومات کے اچھے ہونے پر بھروسا کرلینا نہ چاہیئے، بلکہ نہایت آزادی اور نیک دلی سے اُس کی اصلیت کا امتحان کرنا چاہیئے؛ تاکہ اگر ہم میں کوئی ایسی بات ہو، جو حقیقت میں بد ہو، اور بسبب رسم و رواج کے ہم کو اس کی بدی خیال میں نہ آتی ہو، تو معلوم ہوجاوے، اور وہ بدی ہمارے ملک یا قوم سے جاتی رہے۔

البتہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہر گاہ معیوب اور غیر معیوب ہونا کسی بات کا زیادہ تر اس کے رواج و عدم رواج پر منحصر ہوگیا ہے، تو ہم کسی طرح کسی امر کے رسم و رواج کو اچھا یا بُرا قرار دے سکیں گے۔ بلاشبہہ یہ بات کسی قدر مشکل ہے؛ مگر جبکہ یہ تسلیم کرلیا جاوے کہ بھلائی یا بُرائی فی نفسہ بھی کوئی چیز ہے، تو ضرور ہر بات کی فی الحقیقت بھلائی یا برائی قرار دینے کے لیئے کوئی نہ کوئی طریقہ ہوگا۔ پس ہم کو اس طریقہ کی تلاش کرنے، اور اسی کے مطابق اپنی رسوم و عادات کی بھلائی یا برائی قرار دینے کی پیروی کرنی چاہیئے۔

سب سے مقدم اور سب سے ضروری امر اس کام کے لیئے یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو تعصبات سے اور ان تاریک خیالوں سے جو انسان کو سچی بات کے سُننے اور کرنے سے روکتے ہیں، خالی کریں؛ اور اس دلی نیکی سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کے دل میں رکھی ہے، ہر ایک بات کی بھلائی یا برائی دریافت کرنے پر متوجہ ہوں۔

یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک، اور دوسری قوم اور دوسرے ملک، دونوں کے رسم و رواج کے ساتھ برتنی چاہیئے؛ تاکہ جو رسم و عادت ہم میں بھلی ہے، اس پر مستحکم

رہیں، اور جو ہم میں بُری ہے، اس کے چھوڑنے پر کوشش کریں؛ اور جو رسم و عادت دوسروں میں اچھی ہے، اس کو بلاتعصب اختیار کریں؛ اور جو ان میں بری ہے، اس کے اختیار کرنے سے بچتے رہیں۔

جب کہ ہم غور کرتے ہیں کہ تمام دنیا کی قوموں میں جو رسم و عادات مروّج ہیں، انہوں نے کس طرح ان قوموں میں رواج پایا ہے، تو باوجود مختلف ہونے ان رسومات و عادات کے، ان کا مبدء و منشا منحصر معلوم ہوتا ہے۔

کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو عادتیں اور رسمیں قوموں میں مروّج ہیں، ان کا رواج یا تو ملک کی آب و ہوا کی خاصیّت سے ہوا ہے، یا ان اتّفاقیہ اُمور سے جن کی ضرورت وقتاً فوقتاً بضرورت تمدّن و معاشرت کے پیش آتی گئی ہے، یا دوسری قوم کی تقلید و اختلاط سے مروّج ہوگئی ہیں، یا انسان کی حالت ترقی یا تنزّل نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔

پس ظاہرا یہی چار سبب، ہر ایک قوم، اور ہر ایک ملک میں رسوم و عادات کے مروّج ہونے کا مبدء و منشا معلوم ہوتے ہیں۔

جو رسوم و عادات بمقتضائے آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں، اُنکے صحیح اور درست ہونے میں کچھ شُبہہ نہیں کیونکہ وہ عادتیں قدرت اور فطرت نے ان کو سکھلائی ہیں، جس کے سچ ہونے میں کچھ شبہہ نہیں۔ مگر صرف ان کے برتاؤ کا طریقہ غور طلب باقی رہتا ہے؛ مثلاً، ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ کشمیر میں اور لندن میں سردی کے سبب انسان کو آگ سے گرم ہونے کی ضرورت ہے۔ پس آگ کا استعمال ایک نہایت سچّی اور صحیح عادت دونوں ملکوں کی قوموں میں ہے۔ مگر اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آگ سے استعمال کے لئے یہ بات بہتر ہے کہ مکانات میں ہندسی قواعد سے آتش خانہ بنا کر آگ کی گرمی سے فائدہ اُٹھاویں، یا مٹّی کی کانگڑیوں میں آگ جلا کر گردن میں لٹکائے پھریں، جس سے گورا گورا پیٹ اور سینہ کالا اور بھونڈا ہو جاوے۔

طریق تمدن و معاشرت روز بروز انسان میں ترقی پاتا جاتا ہے؛ اور اس لئے ضرور ہے کہ ہماری رسمیں و عادتیں، جو بضرورت تمدن و معاشرت مروّج ہوئی تھیں، اُن

میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاوے۔ اور اگر ہم اپنی پہلی ہی رسموں اور عادتوں کے پابند رہیں، اور کچھ ترقی نہ کریں، تو بلاشبہ بمقابل اُن قوموں کے جنہوں نے ترقی کی ہے، ہم ذلیل اور خوار ہوں گے؛ اور مثل جانوروں کے خیال کیے جاویں گے، پھر خواہ، ہم اس نام سے بُرا مانیں یا نہ مانیں۔

انصاف کا مقام ہے کہ جب ہم اپنے سے کمتر اور ناتربیت یافتہ قوموں کو ذلیل و حقیر مثل جانوروں کے خیال کرتے ہیں، تو جو قومیں کہ ہم سے زیادہ شایستہ اور تربیت یافتہ ہیں، اگر وہ بھی ہم کو اسی طرح حقیر اور ذلیل مثل جانوروں کے سمجھیں، تو ہم کو کیا مقام شکایت ہے؟ ہاں! اگر ہم کو غیرت ہے، تو ہم کو اس حالت سے نکلنا اور اپنی قوم کو نکالنا چاہیئے۔

دوسری قوموں کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے، مگر جب وہ رسمیں اندھے پنے سے صرف تقلیداً، بغیر سمجھے بوجھے، اختیار کی جاتی ہیں، تو کافی ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں۔ دوسری قوموں کی رسومات اختیار کرنے میں اگر ہم دانائی اور ہوشیاری سے کام کریں، تو اس قوم سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں؛ اس لیے کہ ہم کو اس رسم سے موانست نہیں ہوتی اور اس سبب سے اس کی حقیقی بھلائی یا بُرائی پر غور کرنے کا، بشرطیکہ ہم تعصب کو کام میں نہ لاویں، بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اس قوم کے حالات دیکھنے سے "جس میں وہ رسم جاری ہے" ہم کو بہت عمدہ مثالیں سیکڑوں برس کے تجربہ کی ملتی ہیں، جو اس رسم کے اچھے یا بُرے ہونے کا قطعی تصفیہ کر دیتی ہیں۔

مگر یہ بات اکثر جگہ موجود ہے کہ ایک قوم کی رسمیں دوسری قوم میں بسبب اختلاط اور ملاپ کے، اور بغیر قصد و ارادے کے، اور ان کی بھلائی اور برائی پر غور و فکر کرنے کے بغیر، داخل ہو گئی ہیں، جیسے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا بالتخصیص حال ہے کہ تمام معاملاتِ زندگی، بلکہ بعض اموراتِ مذہبی میں بھی، ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بلاغور و فکر اختیار کر لی ہیں؛ یا کوئی نئی رسم مشابہ اُس قوم کی رسم کے ایجاد کر لی ہے۔

جب ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طریق معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہونچادیں، تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں، وہ ہم کو بنظر حقارت نہ دیکھیں، تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام رسوم و عادات کو بنظر تحقیق دیکھیں؛ اور جو بُری ہوں اُن کو چھوڑیں، اور جو قابل اصلاح ہوں، ان میں اصلاح کریں۔

جو رسومات کہ بسبب حالت ترقی یا تنزل کسی قوم کے پیدا ہوتی ہیں، وہ رسمیں ٹھیک ٹھیک اس قوم کی ترقی اور تنزل، یا عزت اور ذلت، کی نشانی ہوتی ہیں۔ اس مقام پر ہم نے لفظ ترقی یا تنزل کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے، اور تمام قسم کے حالات ترقی و تنزل مراد لئے ہیں، خواہ وہ ترقی و تنزل اخلاق سے متعلق ہو، خواہ علوم و فنون اور طریق معاشرت و تمدن سے، اور خواہ ملک و دولت وجاہ و حشمت سے۔

بلاشبہہ یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں نکلنے کی جس کی تمام رسمیں اور عادتیں عیب اور نقصان سے خالی ہوں۔ مگر اتنا فرق بے شک ہے کہ بعضی قوموں میں ایسی رسومات اور عادات، جو درحقیقت نفس الامر میں بُری ہوں، کم ہیں اور بعضی میں زیادہ۔ اور اسی وجہ سے وہ پہلی قوم پچھلی قوم سے اعلیٰ اور معزز ہے۔ اور بعضی ایسی بھی قومیں ہیں جنہوں نے انسان کی حالت ترقی کو نہایت اعلیٰ درجہ تک پہونچایا ہے، اور اس حالت انسانی کی ترقی نے اُن کے نقصان کو چھپا لیا ہے: جیسے ایک نہایت عمدہ و نفیس شیریں دریا تھوڑے سے گدلے اور کھاری پانی کو چھپا لیتا ہے، یا ایک نہایت لطیف شربت کا بھرا ہوا پیالہ نیبو کی کھٹی دو بوندوں سے زیادہ تر لطیف اور خوشگوار ہو جاتا ہے۔ اور یہی قومیں جو اب دنیا میں سویلائزڈ یعنی مہذب گنی جاتی ہیں اور درحقیقت اس لقب کی مستحق بھی ہیں۔

میری دل سوزی اپنے ہم مذہب بھائیوں کے ہمراہ اسی وجہ سے ہے، کہ میری دانست میں ہم مسلمانوں میں بہت سی رسمیں، جو درحقیقت نفس الامر میں بُری ہیں، مُروّج ہو گئی ہیں، جن میں سے ہزاروں ہمارے پاک مذہب کے بھی خلاف ہیں اور

انسانیت کے بھی مخالف ہیں، اور تہذیب و تربیت و شائستگی کے بھی برعکس ہیں۔ اور اس لئے میں ضرور سمجھتا ہوں کہ ہم سب لوگ تعصّب اور ضد اور نفسانیت کو چھوڑ کر اُن بُری رسموں اور بدعادتوں کو چھوڑنے پر مائل ہوں، اور جیسا کہ ان کا پاک اور روشن، ہزاروں حکمتوں سے بھرا ہوا مذہب ہے، اسی طرح اپنی رسومات معاشرت و تمدن کو بھی عمدہ اور پاک و صاف کریں، اور جو کچھ نقصانات اس میں ہیں، گو وہ کسی وجہ سے ہوں، ان کو دور کریں۔

اس تحریر سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ میں اپنے تئیں ان عادتوں سے پاک و مبرّا سمجھتا ہوں، یا اپنے تئیں نمونۂ عاداتِ حسنہ جتاتا ہوں، یا خود ان امور میں مُقتدا بننا چاہتا ہوں۔ حاشاوکلّا! بلکہ میں بھی ایک فرد انہی افراد میں سے ہوں۔ جن کی اصلاحِ دلی مقصود ہے۔ بلکہ میرا مقصد صرف متوجہ کرنا اپنے بھائیوں کا اپنی اصلاحِ حال پر ہے؛ اور خدا سے امید ہے کہ جو لوگ اصلاح حال پر متوجہ ہونگے، سب سے اوّل اُن کا چیلا اور اُن کی پیروی کرنے والا میں ہوں گا۔ البتہ مثل مخمور کے خراب حالت میں چلا جانا، اور روز بروز بدتر درجہ کو پہونچتا جانا، اور نہ اپنی عزّت کا، اور نہ قومی عزّت کا خیال و پاس رکھنا، اور جھوٹی شیخی اور بے جا غرور میں پڑے رہنا، مجھکو پسند نہیں ہے۔

رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات

کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے کہ " انسان کی زندگی کا منشا یہ ہے کہ اس کے تمام قوائے اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں، اور اُن میں باہم نامناسبت اور تناقض نہ ہو، بلکہ سب کامل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو۔" ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے کہ " آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہونچے، ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق ہے۔"

پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ اگلی روائتوں پر یا پرانی رسم و رواج پر مبنی ہے، تو وہاں انسانوں کی خوشحالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے؛ اور جو کہ خوشحالی ہر فرد بشر کی، اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے، تو اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے، وہ جزو بھی ناپید ہوتا ہے۔

کسی شخص کی یہ رائے نہ ہوگی کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید کے اور کچھ مطلق نہ کرنا چاہیئے، اور نہ کوئی شخص یہ کہے گا کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بسری کے طریقے، اور اپنے کاروبار کی کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے کے مطابق کوئی بات بھی کرنی نہ چاہیئے۔ سیدھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو اس کی جوانی میں اس طرح سے تعلیم ہونی چاہیئے کہ اور لوگوں کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں، اُن کے فوائد سے مستفید ہو؛ اور پھر جب اس کی عقل پختگی پر پہونچے، تو خود ان کی بھلائی اور برائی کو جانچے۔ بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے، گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں، آدمی کی اُن صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی، جو خدائے تعالیٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں۔ اُن قوتوں کا برتاؤ، جو کسی چیز کی بھلائی برائی دریافت

کرنے، اور کسی بات پر رائے دینے، اور دو باتوں میں امتیاز کرنے، اور عقل و
فہم کو تیز رکھنے، بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی اور برائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں،
صرف ایسی ہی صورت میں ممکن ہے، جبکہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا
اختیار حاصل ہو۔

جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے، وہ شخص اس بات کو
پسند یا ناپسند نہیں کرتا، اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل
ہوتا ہے۔ اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جبکہ وہ استعمال
میں لائی جاویں۔ ان قوتوں کو اوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں
ہوتی؛ بلکہ ایسے شخص کے لئے بجز ایسی قوت تقلید کے جو بندروں میں ہوتی ہے، اور کسی قوت
کی حاجت نہیں۔ البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے، وہ اپنی تمام قوتوں سے کام
لیتا ہے۔ زمانۂ حال پر نظر کرنے کے لئے اس کو قوت تحقیق درکار ہوتی ہے، اور انجام کار
پر غور کرنے کے لئے قوتِ تجویز، اور اس کا تصفیہ کرنے کو قوتِ استقرار، اور بھلا برا
ٹھہرانے کو قوتِ امتیاز، اور سب باتوں کے تصفیہ کے بعد اس پر قائم رہنے کے لئے قوت
استقلال؛ اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں۔

آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے کہ جو اس کے واسطے مقرر کر دیا ہے اسی کو انجام دیا
کرے؛ بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو ان اندرونی قوتوں سے جو خدا نے اس میں رکھی
ہیں، اور جن کے سبب سے وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے، ہر چہار طرف پھیلے اور
بڑھے، پھلے اور پھولے۔

جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل سے
کام لیں، اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں۔ یعنی جو
عمدہ و مفید ہیں ان کو اختیار کریں؛ جو قابلِ اصلاح ہوں، ان میں ترمیم کریں؛ اور
جو بری اور خراب ہوں، اُن کی پابندی چھوڑ دیں؛ نہ یہ کہ اندھوں کی طرح، یا
ایک کل کی مانند، ہمیشہ اسی سے لپٹے رہیں۔

یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بُری باتوں میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے، اسلئے کہ انسان کی ذات میں، جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں، ویسے ہی ان کے روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں؛ مثلاً، ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے۔ پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اس نے رسومات کی پابندی نہیں کی؛ بلکہ یہ باعث ہے کہ اس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے؛ اور دوسری قسم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف۔ اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف نہ ہو، یا وہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے، پژمردہ نہ ہو، تو بجز عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب نہ ہو۔

ہمارے زمانہ میں ہر شخص، اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، رسم و رواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی شخص ایک بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔ کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں پوچھتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ اور ہمارے مناسب یا ہماری پسند کے لائق کیا بات ہے؟ یا جو عمدہ صفتیں مجھ میں ہیں، اُنکا ظہور نہایت عمدگی سے کس طرح ممکن ہے؟ اور کونسی بات اُن کی ترقی اور شگفتگی کی معاون ہے؟ بلکہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتے ہیں کہ میری حالت اور رتبہ کے کونسی چیز مناسب ہے؟ میرے رتبہ اور مقدور کے آدمی کس رسم و رواج کے مطابق کام کرتے ہیں؟ اور کوئی اس سے بھی زیادہ بیوقوف ہوا، تو وہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر سوال کرتا ہے، اور یوں پوچھتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے برتر ہیں، اور رتبہ اور مقدور میں زیادہ ہیں، وہ کن رسموں کو بجا لاتے ہیں؟ تاکہ یہ شخص بھی ویسا ہی کر کر انہی کی سی شان میں شامل ہو۔

اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جو لوگ اس طرح پر رسومات کو بجا لاتے ہیں، وہ اپنی خواہش اور مرضی سے اُن رسومات کو اور چیز دل پر ترجیح دیتے ہیں، اور ترجیح دیکر پسند کرتے ہیں۔ نہیں! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے، اور کسی بات کی خواہش کرنے کا موقع یا اتفاق نہیں ہوتا؛ اور اسلئے

رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات

طبیعت خود متحمل اور مطیع رسموں کی ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ، جو باتیں دل کی خوشی
کی کرنی ہوتی ہیں، ان میں بھی اوروں کے مطابق کام کرنے کا خیال اول دل میں آتا ہے۔
غرض کہ اُن کی پسند وہی ہوتی ہے، جو بہت سے لوگوں کی ہے۔ وہ صرف ایسی
باتوں کے پسند کرنے پر راغب ہوتے ہیں، جو عام پسند ہوں؛ اور مذاق اور اصلی
سلیقہ جو رسم و رواج کے مطابق نہ ہو، اس سے ایسی ہی گریز کی جاتی ہے جیسے کہ جُرموں
سے! یہاں تک کہ اپنی خاص طبیعت کی پیروی نہ کرتے نہ کرتے، ان میں اپنی طبیعت
ہی باقی نہیں رہتی، کہ جس کی پیروی کریں؛ اور ان کی ذاتی قوتیں، بالکل پژمردہ
اور بے کار رہنے کے سبب بالکلیہ ضائع ہو جاتی ہیں؛ اور جو شخص اپنی دلی خواہش کرنے،
اور ذاتی خوشی اٹھانے کے قابل نہیں رہتے، اور عموماً ایسی طبعزاد رائیں یا خیالات نہیں
رکھتے، جو خاص ان کی اصلی خوشی سے مخصوص ہوں۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ
انسان کی ایسی حالت پسندیدہ ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ ۸

رسومات جو مقرر ہوتی ہیں، غالباً اس زمانہ میں جبکہ وہ مقرر ہوئیں، مفید
تصوّر کی گئی ہوں؛ مگر اس بات پر بھروسہ کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں، محض غلطی
ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا، ان کی رائے میں غلطی ہو؛ انکا
تجربہ صحیح نہ ہو؛ یا ان کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو؛ یا
اس تجربہ کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہوا ہو؛ یا وہ رسم اس وقت اور اس زمانہ میں مفید
ہو، اِلاحال کے زمانہ میں مفید نہ رہا ہو بلکہ مضر ہو؛ یا وہ رسم جن حالات پر قائم کی
گئی تھی، کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو۔ غرض رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر
نقصان کا باعث ہے۔ اگر کوئی نقصان نہ ہو، تو یہ نقصان تو ضرور ہے کہ آدمی کی
عقل اور دانش، اور جودتِ طبع، اور قوتِ ایجاد باطل ہو جاتی ہے۔

یہ بات بے شک ہے کہ کسی عمدہ بات کی ایجاد کی لیاقت ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی،
بلکہ چند دانا شخصوں کو ہوتی ہے، جن کی پیروی اور سب لوگ کرتے ہیں۔ لیکن
رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں بہت بڑا فرق ہے۔ رسومات کی پابندی

میں اسکی بھلائی و بُرائی و مفید و غیر مفید و مناسب حال و مطابق طبع ہونے یا ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا، اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پابندی کی جاتی ہے؛ اور دوسری حالت میں بوجہ پسندیدہ ہونے کے، اور اسلئے دوسری حالت میں، جو قوتیں ترقی کی انسان میں ہیں؛ وہ معدوم و مفقود نہیں ہوتیں، اِلّا پہلی حالت میں معدوم و نابود ہو جاتی ہیں۔

رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع و مزاحم ہے۔ چنانچہ وہ پابندی ایسی قوتِ طبعی کے، جس کے ذریعے سے بہ نسبت معمولی باتوں کے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جاوے، برابر مخالف رہتی ہے، اور انسان کی تنزل حالت کا اصلی باعث ہوتی ہے۔ اب اس رائے کا دنیا کی موجودہ قوموں کے حال سے مقابلہ کرو! تمام مشرقی یا ایشیائی ملکوں کا حال دیکھو کہ ان ملکوں میں تمام باتوں کے تصفیہ کا مدار رسم و رواج پر ہے۔ ان ملکوں میں مذہب اور استحقاق اور انصاف کے لفظوں سے رسموں کی پابندی مراد ہوتی ہے۔ پس اب دیکھو کہ مشرقی اور ایشیائی قوموں کا، جن میں مسلمان بھی داخل ہیں، کیسا ابتر اور خراب اور ذلیل حال ہے۔

ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی کسی زمانہ میں قوتِ عقل، اور جودتِ طبع، اور مادۂ ایجاد ضرور موجود ہوگا، جس کی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں، جو اب رسمیں ہیں؛ اسلئے کہ ان کے بزرگ، ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ اور حُسنِ معاشرت کے فنون سے واقف پیدا نہیں ہوئے تھے، بلکہ یہ سب باتیں انہوں نے اپنی محنت اور علم و عقل اور جودتِ طبع سے ایجاد کی تھیں، اور انہی وجوہات سے دنیا کی نہایت بڑی اور قوی اور مشہور قوموں سے ہو گئے تھے۔ مگر اب ان کا حال دیکھو کہ کیا ہے؟ اسی رسومات کی پابندی سے اُن کا مآل یہ ہوا ہے، کہ اب وہ ایسی قوموں کے محکوم ہیں، اور ایسے لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہیں، جن کے آباؤ اجداد اُس وقت جنگلوں میں آوارہ پڑے پھرتے تھے، جس وقت ان قوموں کے آباؤ اجداد عالی شان محلوں میں رہتے تھے، اور بڑے بڑے عبادت خانے، اور مکانات شاہی اور شہنشاہی محل بنواتے تھے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ اس زمانہ میں اُن قوموں میں رسم کی پابندی قطعی نہ تھی، اور جو کسی قدر تھی بھی، تو اس کے ساتھ ہی آزادی اور

ترقی کا جوش ان میں قائم تھا۔
تو اریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے، اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ مگر یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اسی وقت مسدود ہوتی ہے جبکہ اس قوم میں سے وہ قوت اُٹھ جاتی ہے، جس کے سبب سے نئی نئی قوتیں پیدا ہوتی ہیں؛ اور ٹھیک ٹھیک مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہی حال ہے؛ بلکہ میں نے غلطی کی، کیونکہ ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گزر گیا، اور تنزل اور ذلت و خواری کا زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہونچ گیا ہے۔
ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ بات کہے کہ یورپ کی قوموں میں بھی، جو اس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی حالت میں شمار ہوتی ہیں، بہت سی رسمیں ہیں، اور ان رسموں کی نہایت درجہ پر پابندی ہے، تو وہ قومیں کیوں ترقی پر ہیں؟ یہ اعتراض صحیح ہے، اور درحقیقت یورپ میں رسموں کی پابندی کا نہایت نقصان ہے؛ اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوتی رہیگی، جیسے کہ اب تک ہوتی رہی ہے، تو ان کو بھی بدنصیبی کا دن پیش آوے گا۔ مگر یورپ میں اور مشرقی ملکوں کی پابندی رسومات میں ایک بڑا فرق ہے۔ یورپ میں رسومات کی پابندی ایک عجیب اور نئی بات ہونے کو تو مانع ہے، مگر رسومات کی تبدیلی کا کوئی مانع نہیں۔ اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے، اور سب لوگ پسند کریں، فی الفور پُرانی رسم چھوڑ دیجاویگی، اور نئی رسم اختیار کر لی جاویگی؛ اور اس سبب سے ان لوگوں کے قوائے عقلی اور حالت تمیز اور قوتِ ایجاد ضائع نہیں ہوتی۔
تم دیکھو کہ یہ پوشاک جو اب انگریزوں کی ہے، ان کے باپ دادا کی نہیں ہے، بالکل اپنی پوشاک بدل دی ہے۔ ہر درجہ کے لوگوں کا جو مختلف لباس تھا، اس رسم کو چھوڑ دیا گیا ہے، اور ضرور سمجھا گیا ہے کہ ہر شخص ایک سا مثل اوروں کے لباس پہنے۔ مگر اس وقت کوئی رسم یورپ میں ایسے درجہ پر نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اس کے برخلاف، اس سے عمدہ ایجاد کرے، اور لوگ اس پر اتفاق نہ کریں، اسی وقت تبدیل نہ ہو سکے؛ اور اسی تبدیلی کے ساتھ ان کی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ نئی نئی کلیں ہمیشہ ایجاد

ہوتی رہتی ہیں، اور تا وقتیکہ اُن کی جگہ بہتر کلیں ایجاد نہ ہو جاویں، وہ بدستور رہتی ہیں. ملکی معاملات اور تعلیم میں، بلکہ اخلاق میں، بلکہ مذہب میں، ہمیشہ ترقی کے خواہاں ہیں. پس یہ تصور کرنا کہ یورپ بھی مثل ہمارے دوسری قسم کی رسموں میں مبتلا ہے، محض نادانی اور ناواقفیت کا سبب ہے.

البتہ یورپ میں، اور بالتخصیص انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ اور قابل تعریف اور لائق خواہش کے ہے، اور درحقیقت بغیر اس کے کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہو سکتی، وہی بات ان کے تنزل کا باعث ہوگی، بشرطیکہ اُس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی؛ اور وہ یہ ہے کہ تمام انگریز جو حُبّ وطن میں نامی ہیں، اس بات پر نہایت کوشش اور جانفشانی کر رہے ہیں کہ کُل قوم کے لوگ یکساں ہو جائیں، اور سب اپنے خیالات اور طریقے یکساں مسائل اور قواعد کے تحت حکومت کر دیں؛ اور ان کوششوں کا نتیجہ انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے. جو حالات کہ اب خاص خاص لوگوں اور فرقوں کے پائے جاتے ہیں، اور جن کے سبب ان کی خاص خاص عادتیں قائم ہوئی ہیں، وہ اب روز بروز ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے جاتے ہیں. انگلستان میں اس زمانہ سے پہلے مختلف درجوں کے لوگ، اور مختلف ہمسایوں کے لوگ، اور مختلف پیشہ والے، گویا جدی جدی دنیا میں رہتے تھے؛ یعنی سب کا طریقہ اور عادت جدا جدا تھی. اب وہ سب طریقے اور عادتیں ہر ایک کی ایسی مشابہ ہو گئی ہیں کہ گویا سب کے سب ایک محلے کے رہنے والے ہیں. انگلستان میں بہ نسبت سابق کے اب بہت زیادہ رواج ہو گیا ہے کہ لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات پڑھتے ہیں، اور ایک ہی سی باتیں سُنتے ہیں، اور ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں، اور ایک ہی سے مقاموں میں جاتے ہیں اور یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں، اور یکساں ہی چیزوں کا خوف کرتے ہیں، اور ایک ہی سے حقوق آزادی سب کو حاصل ہیں، اور ان حقوق اور آزادیوں کے قائم رکھنے کے ذریعے بھی یکساں ہیں؛ اور یہ مشابہت اور مساوات روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے، اور تعلیم و تربیت کی مشابہت اور مساوات سے اسکو اور زیادہ وسعت

رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات

ہوتی ہے۔ تعلیم کے اثر سے تمام لوگ عام خیالات کے، اور غلبہ اور رائے کے پابند ہوتے جاتے ہیں؛ اور جو عام ذخیرہ حقائق اور مسائل اور رایوں کا موجود ہے، اس پر سب کو رسائی ہوتی ہے۔ آمدورفت کے ذریعوں کی ترقی سے مختلف مقاموں کے لوگ مجتمع اور شامل ہوتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں، اور اس سبب سے بھی مشابہت مذکور ترقی پاتی ہے۔ کارخانوں اور تجارت کی ترقی سے آسائش اور آرام کے وسیلے اور فائدے زیادہ شائع ہوتے ہیں؛ اور ہر قسم کی عالی ہمتی، بلکہ بڑی سے بڑی اولوالعزمی، کے کام ایسی حالت کو پہونچ گئے ہیں کہ ہر شخص ان کے کرنے کو موجود مستعد ہوتا ہے۔ کسی خاص شخص یا گروہ پر منحصر نہیں رہا ہے، بلکہ اولوالعزمی تمام لوگوں کی خاصیت ہوتی جاتی ہے، اور ان سب پر آزادی اور عام رائے کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے؛ اور یہ تمام امور ایسے ہیں جیسے انگلستان کے تمام لوگوں کی رائیں اور عادتیں اور طریق زندگی اور قواعد معاشرت اور امورات رنج و راحت یکساں ہوتے جاتے ہیں۔ اور بلا شبہہ ملک اور قوم کے مہذب ہونے کا اور ترقی پر پہونچنے کا یہی نتیجہ ہے، اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے کہ اس سے عمدہ نہیں ہوسکتا ہے۔

مگر باوصف اس کے ہم اس نتیجہ کو، بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے، باعث تنزل قرار دیتے ہیں، تو ضرور ہم کو کہنا پڑے گا کہ کیوں یہ عمدہ نتیجہ باعث تنزل ہوگا؟ سبب اس کا یہ ہے، کہ جب سب لوگ ایک سی طبیعت اور عادت اور خیال کے ہو جاتے ہیں، تو ان کی طبیعتوں میں سے وہ قوتیں جو نئی باتوں کے ایجاد کرنے، اور عمدہ عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعد حسن معاشرت کو ترقی دینے کی ہیں، زائل اور کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ ترقی ٹھہر جاتی ہے، اور پھر ایسا زمانہ آتا ہے کہ تنزل شروع ہو جاتا ہے۔

اس معاملہ میں ہم کو چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے۔ چینی بہت لئیق آدمی ہیں، بلکہ اگر بعض باتوں پر لحاظ کیا جاوے تو عقلمند بھی ہیں؛ اور اس کا سبب یہ ہے کہ اُن کی خوش قسمتی سے ابتدا ہی میں ان کی قوم میں بہت اچھی

اچھی رسمیں قائم ہوگئیں، اور یہ کام ان لوگوں کا تھا جو اس قوم میں نہایت دانا اور بڑے حکیم تھے۔

چین کے لوگ اس باب میں مشہور و معروف ہیں کہ جو عمدہ سے عمدہ دانش و عقل کی باتیں ان کو حاصل ہیں، ان کو ہر شخص کی طبیعت پر بخوبی منقش کرنے کے واسطے، اور اس بات کے لئے کہ جن شخصوں کو وہ دانشمندی کی باتیں حاصل ہیں ان کو بڑے بڑے عہدے ملیں، نہایت عمدہ طریقے ان میں رائج ہیں؛ اور وہ طریقے حقیقت میں بہت ہی عمدہ ہیں۔ بے شک جن لوگوں نے اپنا ایسا دستور قائم رکھا، انہوں نے انسان کی ترقی کے اسرار کو پالیا، اور اس لئے چاہیئے تھا کہ وہ قوم تمام دنیا میں ہمیشہ افضل رہتی، مگر برخلاف اس کے ان کی حالت سکون پذیر ہوگئی ہے اور ہزاروں برس سے ساکن ہے؛ اور اگر ان کی کبھی کچھ ترقی ہوگی، تو بے شک غیر ملکوں کے لوگوں کی بدولت ہوگی۔ اس خرابی کا سبب یہی ہوا کہ اس تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہوگئی، اور سب کے خیالات اور طریق معاشرت ایک سے ہوگئے، اور سب کے سب یکساں قواعد اور مسائل کی پابندی میں پڑ گئے، اور اس سبب سے وہ قوتیں جن سے انسان کو روز بروز ترقی ہوتی ہے ان میں سے معدوم ہوگئیں۔

پس جبکہ ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے، جن کی رسومات بھی عمدہ اصول و قواعد پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور کوئی رسم بلا خیال اور قوموں کے اختلاط سے آگئی ہے، جس میں ہزاروں نقص اور برائیاں ہیں، پھر ہم اُن رسموں کے پابند ہوں، اور نہ ان کی بھلائی برائی پر غور کریں، اور نہ خود کچھ اصلاح اور درستی کی فکر میں ہوں، بلکہ اندھا دھندی سے انہی کی پیروی کرتے چلے جاویں، تو سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا حال کیا ہوگیا ہے، اور آئندہ کیا ہونے والا ہے۔

ہماری نوبت چینیوں کے حال سے بھی رسومات کی پابندی کے سبب بد تر ہوگئی ہے؛ اور اب ہم خود اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہم اپنی ترقی کرسکیں، اس لئے بجز اس کے کہ دوسری قوم ہماری ترقی اور ہمارے قوائے عقلی کی تحریک کا باعث ہو

اور کچھ چارہ نہیں۔ بعد اس کے کہ ہمارے قوائے عقلیہ تحریک میں آجاویں اور پھر قوت ایجاد ہم میں شگفتہ ہو، تب ہم پھر اس قابل ہوں گے کہ خود اپنی ترقی کے لئے کچھ کر سکیں۔
مگر جب ہم دوسری قوموں سے از راہ تعصب نفرت رکھیں، اور کوئی نیا طریقۂ زندگی کہ وہ کیسا ہی بے عیب ہو اختیار کرنا، صرف بسبب اپنے تعصب یا رسم و رواج کی پابندی کے، معیوب سمجھیں، تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے۔

اپنی مدد آپ

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا، اور قوموں کا، اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔

ایک شخص میں اپنی مدد آپ کرنے کا جوش، اس کی ترقی کی سچی بنیاد ہے؛ اور جبکہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے، تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت، اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے۔ جب کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لیے، کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے، تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنی مدد آپ کرنے کا کم ہوجاتا ہے، اور ضرورت اپنے آپ مدد کرنے کی، اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے؛ اور اسی کے ساتھ غیرت، جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے، اور اسی کے ساتھ عزت، جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے، از خود جاتی رہتی ہے؛ اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو، تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھوں میں ذلیل، اور بے غیرت، اور بے عزت ہو جاتی ہے۔

آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں، خواہ اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں، یہ امر بدیہی اور لابدی ہے کہ وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے ہموطن بھائیو! کیا تمہارا یہی حال نہیں ہے؟

ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں، کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے؛ یہ سمجھتے تھے کہ عمدہ انتظام قوم کی عزت وبھلائی وخوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے، خواہ

وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو، یا گورنمنٹ کا۔ اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کر، ان کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے! مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں۔

ایک شخص، فرض کرو کہ پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جاوے، قومی عزت اور قومی بھلائی اور قومی ترقی کیا کر سکتا ہے؟ برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دے دینے سے، گو وہ کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو، قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے؛ بلکہ خود اس کے چال چلن پر، اس کے برتاؤ پر بھی اس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا، تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں! یہ بات بے شبہہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی، مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قوائے عمل کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔

یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مثبت اور معمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے، اور وہ فرض جان اور مال اور آزادی کی حفاظت ہے۔ جب کہ قانون کا عملدرآمد دانشمندی سے ہوتا ہے، تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ حظ اٹھا سکتا ہے۔ جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے، اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے؛ مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہ ہو، سست آدمی کو محنتی، فضول خرچ کو کفایت شعار، شراب خوار کو تائب نہیں بنا سکتا؛ بلکہ یہ باتیں محنت، کفایت شعاری، نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی، قومی عزت، قومی اصلاح، عمدہ عادتوں، عمدہ چال چلن، عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہیں، نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ اعلیٰ درجے حاصل کرنے سے۔

نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً ان لوگوں کا، جن پر وہ حکومت کرتی

ہے، عکس ہوتی ہے. جو رنگ ان کا ہوتا ہے، اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے. جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے، رعایا اس کو زبردستی پیچھے کھینچ لاتی ہے! اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب و شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے، وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھنچ جاتی ہے.

یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے، کہ جیسا مجموعہ قوم کے چال چلن کا ہوتا ہے، یقینی اس کے موافق اس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے. جس طرح کہ پانی خود بخود نیسال میں آجاتا ہے، اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے! اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھٹر حکومت کرنی پڑتی ہے.

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت، بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن، اخلاق و عادت، تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے! کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے، اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی پر ہے، جن سے وہ قوم بنی ہے.

قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا. اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی، شخصی بے عزتی، شخصی بے ایمانی، شخصی خود غرضی کا، اور شخصی برائیوں کا. ناتہذیبی و بدچلنی، جو اخلاقی و تمدنی، یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے، درحقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے. اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کردیں، تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جاویں گی، جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ دی جاوے.

اے میرے عزیز ہموطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے، تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیرخواہی کرو. غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور

شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو، تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو. کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا، بات چیت کا، وضع لباس کا، سیر سپاٹے کا، شغل و اشغال کا تمہاری اولاد کے لیئے ہے، اُس سے ان کی شخصی چال چلن، اخلاق و عادات، نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؟ حَاشَا وَكَلَّا!

جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اصلاح کر سکتی ہے، تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا، کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح کرے، کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے. وہ شخص در حقیقت غلام نہیں ہے، جس کو ایک ناخدا ترس نے، جو اس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے، خرید لیا ہے؛ یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے؛ بلکہ در حقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے، جو بداخلاقی، خود غرضی، جہالت اور شرارت کا مطیع، اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا و قومی ہمدردی سے بے پروا ہے. وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں، وہ بیرونی زوروں سے، یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے، آزاد نہیں ہو سکتیں، جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو.

جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے، اس وقت تک کوئی مستقل، اور برتاؤ میں آنے کے قابل، نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا. گو کیسی ہی عمدہ تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں، وہ تبدیلیاں فانوس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں، جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں.

مستقل اور مضبوط آزادی، سچی عزت، اصلی ترقی، شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر منحصر ہے؛ اور وہی شخصی چال چلن، معاشرت و تمدن کا محافظ؛ اور وہی شخصی چال چلن، قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے. "جان

اسٹیورٹ مِل"، جو اس زمانہ میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گذرا ہے، اس کا قول ہے کہ "ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کرسکتی، اگر اس کی رعایا میں شخصی اصلاح، اور شخصی ترقی موجود ہے! اور جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے، درحقیقت وہی شے اس کے لئے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے، پھر اس شے کو چاہو جس نام سے پکارو." اس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ کرتا ہوں، کہ جہاں شخصی اصلاح و شخصی ترقی مٹ گئی ہے، یا دب گئی ہے، وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ گورنمنٹ کیوں نہ قائم کی جاوے، وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کرسکتی.

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضرؑ ملے، گورنمنٹ فیاض ہو، اور ہمارے سب کام کردے. اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے کی جاوے اور ہم خود کچھ نہ کریں. یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جاوے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کردے، اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے. حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے! اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں، جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے. کیا لالہ اشرفی مل، جو ہر روز لچھمی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں، انسانوں میں کچھ قدر و منزلت کے لائق گنے جاتے ہیں؟

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط، جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے، وہ اپنی مدد آپ کرنا ہے. جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھنے اور کام میں لاویں گے، تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاویں گے. اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ، یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں: پچھلا، انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے! اور پہلا، خود انسان کو.

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجراء کی خواہش! یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال

نے ڈبلن کی نمائش گاہ دستکاری
ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈراگن
میں کہا تھا کہ:

"جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں، اسی وقت مجکو میرا ملک
اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لئے بہت سی
باتیں سنتے آئے ہیں؛ مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری
میں یقین کرتا
محنت، ہماری آزادی، ہمارے اوپر منحصر ہے۔
ہوں کہ اگر ہم محنت کئے جاویں، اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال
کریں، تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع، یا آئندہ کی قوی توقع اپنی بہتری
کے لئے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر
ہم ایک دلی دلولہ اور محنت سے کام کئے جائیں گے، تو مجھے پورا یقین ہے
کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و خوشی
و آزادی کی ہو جاوے گی۔"

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان
کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوئی ہے۔
محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں، زمین کے جوتنے والوں، کانوں
کے کھودنے والوں، نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں، مخفی باتوں کو
ڈھونڈھ کر نکالنے والوں، آلات جر ثقیل سے کام لینے والوں، اور ہر
قسم کے پیشے کرنے والوں، ہنرمندوں، شاعروں، حکیموں، فیلسوفوں،
ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہونچانے میں بڑی مدد دی ہے۔
ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے، اور اس کو ایک
اعلیٰ درجہ تک پہونچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے، جو تہذیب و شائستگی
کی عمارت کے معمار ہیں، لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر
میں، جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھے، ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ

رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بیش بہا جائداد کا وارث کیا ہے، جو ہمارے پرکھوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیّا ہوئی تھی؛ اور وہ جائداد ہم کو اسلئے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل "مارِ سرِ گنج" اس کی حفاظت ہی کیا کریں؛ بلکہ ہم کو اس لئے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں، اور ترقی یافتہ حالت میں، آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جائیں، مگر افسوس! صد ہزار افسوس!! کہ ہماری قوم نے اُن پرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو بھی گرا دیا۔

انگریزوں کو جو دنیا کے اس دَور میں اس قدر ترقی ہوئی، اس کا سبب صرف یہی ہے کہ ہمیشہ ان کی قوم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ رہا ہے، اور اس قوم کی شخصی محنت اس پر گواہ عادل ہے۔ یہی مسئلہ اپنی مدد آپ کرنے کا انگریزوں کی طاقت کا سچا پیمانہ رہا ہے۔ ان میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے، جو تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور زیادہ مشہور تھے، اور جن کی تمام لوگ عزت بھی کرتے تھے، لیکن کم درجے کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گروہوں میں سے بھی اس قوم کی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ گو کسی لڑائی اور میدانِ کارزار کی فہرستوں اور تاریخوں میں صرف بڑے بڑے جنرلوں اور سپہ سالاروں کے نام لکھے گئے ہوں، لیکن وہ فتوحات ان کو زیادہ تر انہی محنتی لوگوں کی شجاعت اور بہادری کے سبب ہوئی ہیں۔

عام لوگ ہی تمام زمانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے شخص ہیں جن کی زندگی کا حال کسی نے نہیں لکھا؛ لیکن تہذیب و شائستگی اور ترقی پر ان کا بھی ایسا ہی قوی اثر ہوا ہے، جیسا کہ ان خوش نصیب مشہور، نامور آدمیوں کا ہوا ہے، جن کی زندگی کے حالات مورخوں نے اپنی تاریخوں میں لکھے ہیں۔

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی، جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے، اس شخص کا اس کے زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں، اس کے ملک، اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے؛

کیونکہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا، مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے، اور آئندہ نسل کے لئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی ہی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی، اور برتاؤ، اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے، اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے۔ جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں، تو مکتب و مدرسے اور مدرسۃ العلوم کی تعلیم اس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا، یعنی زندگی کے برتاؤ کے علم کا، جس کو انگریزی میں 'لائف ایجوکیشن' کہتے ہیں، انسان پر، قوم پر، بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ و مدرسۃ العلوم کا علم طاق میں، یا صندوق میں، یا الماری میں، یا کسی بڑے کتبخانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے، مگر زندگی کے برتاؤ کا علم، ہر وقت دوست سے ملنے میں، گھر کے رہنے سہنے میں، شہر کی گلیوں میں پھرنے میں، صرافہ کی دوکان کرنے میں، ہل جوتنے میں، کپڑا بُننے کے کارخانے میں، کلوں سے کام کرنے کے کارخانے میں اپنے ساتھ ہوتا ہے! پھر بے سکھائے، اور بے شاگرد بنائے، لوگوں میں صرف اس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔

یہ پچھلا علم وہ علم ہے، جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اس پچھلے علم سے عمل، چال چلن، تعلیم نفسی، نفس کُشی، شخصی خوبی، قومی مضبوطی، قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی پچھلا علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے، اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے، اور زندگی کے کاروبار کرنے، اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا، اور نہ یہ تعلیم کسی درجہ کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔

'لارڈ بیکن' کا نہایت عمدہ قول ہے کہ "علم سے عمل نہیں آجاتا! علم کو عمل میں لانا، علم سے باہر اور علم سے برتر ہے۔ اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو باعمل یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے۔" علم کی بہ نسبت عمل، اور سوانحعمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن، آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بناتا ہے۔

سمجھ یا فہم

میرا خیال ہے کہ اگر انسانوں کے دلوں کو چیر کر اُن کا حال دیکھا جاوے، تو دانا اور نادان دونوں کے دلوں میں کچھ تھوڑا سا ہی فرق نکلے گا۔ دونوں کے دلوں میں ہمیشہ بہت سے لغو اور بے ہودہ خیال آتے ہیں؛ بے شمار وَسوَسے دونوں کے دلوں میں اُٹھتے ہیں؛ مگر ان دونوں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ دانا آدمی اُن میں سے انتخاب کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کون سے خیالات ایسے ہیں جن کو گفتگو میں لانا چاہیئے، اور کون سے ایسے ہیں جن کو چھوڑ دینا چاہیئے؛ نادان آدمی ایسا نہیں کرتا، اور جو خیال اس کے دل میں آتا ہے، بے سوچے سمجھے مُنہ سے بکتا جاتا ہے۔ دانشمند آدمی بھی دوستوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں نادان کی مانند ہوتا ہے؛ جو اس کے دل میں آتا ہے، بے تردّد دوست سے کہتا ہے، گویا اس کے خیالات ہی ایک بلند آواز میں آتے ہیں۔

'پبلی' صاحب کا یہ قول ہے کہ

> انسان کو دُشمن کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ رکھنا چاہیئے کہ اس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے؛ اور دوست سے اس طرح برتاؤ کرنا چاہیئے، کہ اگر وہ کبھی دشمن ہو جاوے تو اس کو ضرر سے بچنے کی جگہ رہے۔

اس قول کی پہلی بات جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کی ہے، وہ تو نہایت عمدہ ہے، مگر پچھلی بات، جو دوست کے ساتھ برتاؤ کی ہے، وہ کچھ اچھی نہیں۔ اس میں سمجھ کی کچھ بھی بات نہیں ہے، بلکہ نری مکّاری ہے۔ ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے؛ اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات نہیں کہہ سکتا!

یہ سچ ہے کہ بعض دفعہ دوست دشمن ہو جاتے ہیں، اور دوست کے بھید کو کھول دیتے ہیں۔ مگر دنیا ان ہی کو دغاباز اور برا کہتی ہے! اور دوست پر بھروسا کرنے والے کو ناسمجھ نہیں کہتی! ہاں! البتہ دوستوں کے منتخب کرنے میں بڑی سمجھ چاہیئے۔

سمجھ صرف باتوں ہی میں منحصر نہیں ہے، بلکہ ہر قسم کے کاموں سے بھی متعلق ہے! اور گویا ہماری زندگی میں ہمارے تمام کاموں کی رہنما، اور ہمارے لیئے ہمارے قادر مطلق خدا کی نایب ہے۔ انسان میں بہت سی بڑی عمدہ عمدہ صفتیں ہیں، مگر سمجھ سب سے زیادہ مفید ہے۔ سمجھ ہی کے سبب سے اور تمام صفتوں کی قدر ہوتی ہے۔ سمجھ ہی کے سبب سے وہ تمام صفتیں اپنے اپنے موقع پر کام آتی ہیں۔ سمجھ ہی کے سبب سے وہ شخص جس میں وہ صفتیں ہیں، اُن صفتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سمجھ بغیر، علم اور عقل دونوں ناچیز ہیں۔ بھلائی برائی دکھائی دیتی ہے۔ باوجودیکہ انسان میں نہایت عمدہ عمدہ خصلتیں ہوتی ہیں، مگر سمجھ بغیر، ان کے برتاؤ میں غلطیاں کرتا ہے، اور نقصان پر نقصان اٹھاتا ہے۔ سمجھ ہونے سے صرف ان ہی خوبیوں کا جو اس میں ہیں، مالک نہیں ہوتا، بلکہ دوسروں میں جو خوبیاں ہیں، ان کا بھی مالک بن جاتا ہے۔ سمجھ دار آدمی جس سے گفتگو کرتا ہے اُس کی لیاقت کو بھی جان لیتا ہے، اور اسی کی لیاقت کے موافق گفتگو کرتا ہے۔

اگر ہم انسانوں کے مختلف فرقوں اور گروہوں اور جماعتوں کی مجلسوں کے حالات پر غور کریں، تو ہم کو صاف معلوم ہوگا کہ ہر ایک مجلس میں نہ کسی عقلمند کی گفتگو کو غلبہ ہوتا ہے، اور نہ کسی بہادر اور دلیر کی گفتگو کو! بلکہ اسی شخص کی گفتگو سب پر غالب رہتی ہے، جس کو سمجھ ہے، اور جو اہلِ مجلس کی لیاقتوں کو، اور جو بات کہنی ہے اور جو نہ کہنی ہے، اس میں تمیز کر سکتا ہے۔

جس شخص کو بڑی سے بڑی لیاقت حاصل ہو، پر سمجھ نہ ہو، وہ ایک نہایت قوی اور زبردست، پر اندھے آدمی کی مانند ہے، جو بسبب اپنے اندھے پن کے، اپنے زور و قوت سے کچھ کام نہیں لے سکتا ہے۔ گو ایسے شخص

کو دنیا میں اور سب طرح کے کمال حاصل ہوں، مگر سمجھ نہ ہو تو وہ دنیا میں کسی کام کا نہیں، برخلاف اس کے، اگر اُس کی سمجھ پوری ہو، اور صرف اسی ایک صفت میں اس کو کمال ہو، اور باقی اوصاف متوسط درجہ کا رکھتا ہو، تو وہ اپنی زندگی میں جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔

سمجھ جس طرح کہ انسان کے لئے ایک بہت بڑا کمال ہے، اسی طرح مکر اس کے حق میں بہت بڑا وبال ہے۔ نیک دل کی منتہائے خوبی سمجھ ہے؛ اور بد دل کی منتہا ربدی؛ یا یوں کہو کہ وہ نیک دل کے لئے معراج ہے؛ اور یہ بد دل کے لئے کمال۔ سمجھ نہایت عمدہ اور نیک مقصد پیدا کرتی ہے، اور ان کے حاصل ہونے کو نہایت عمدہ عمدہ اور تعریف کے قابل ذریعے قائم کرتی ہے؛ مگر مکر میں صرف خودغرضی ہوتی ہے۔ سمجھ مثل ایک روشن آنکھ کے ہے، جس میں بے انتہا وسعت ہے، اور تمام دنیا کو، اور دور دور کی چیزوں کو، آسمانوں کو، اور آسمانوں کے ستاروں کو بخوبی دیکھ سکتی ہے؛ مکر مثل ایک کوتاہ نظر آنکھ کے ہے، جو پاس پاس کی ناچیز چیزوں کو دیکھ سکتی ہے، اور دور کی چیزیں، گو وہ کیسی ہی عمدہ اور روشن ہوں، اسے نظر نہیں آتیں۔ سمجھ جسقدر ظاہر ہوتی جاتی ہے، اسی قدر انسان کا اختیار اور اعتبار بڑھتا جاتا ہے؛ مگر مکر کاٹ کی ہنڈیا کی مانند ہے، کہ جب ایک دفعہ کھُل گیا تو پھر اس کی قوت اور عزت بالکل جاتی رہتی ہے۔ پھر انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ جو کام کہ وہ ایسی حالت میں کر سکتا، جبکہ لوگ اس کو ایک سیدھا سادا، بھولا بھالا آدمی سمجھتے، اب وہ کام بھی وہ نہیں کر سکتا۔ سمجھ عقل کے لئے کمال ہے، اور ہمارے کاموں کے لئے رہنما؛ مگر ایک قوت ہے جو صرف حال ہی کے فائدوں کو دیکھتی ہے۔ سمجھ نہایت عقلمند اور نیک آدمیوں میں پائی جاتی ہے؛ مکر اکثر جانوروں میں، اور ان لوگوں میں جو جانوروں کی مانند، یا اُن سے کچھ بہتر ہوتے ہیں، پایا جاتا ہے۔ سمجھ نفس الامر میں ایک نہایت خوبصورت دلکش چیز ہے؛ اور مکر گویا اس کی بگاڑی ہوئی نقل ہے۔

سمجھ یا فہم

سمجھ والے آدمی کی طبیعت ہمیشہ زمانہ حال اور استقبال دونوں پر لگی رہتی ہے۔ جو باتیں کہ زمانۂ دراز کے بعد ہونے والی ہیں، اور جو اب ہو رہی ہیں، دونوں کو دیکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ رنج و خوشی جو دوسری زندگی یعنی قیامت میں ہونے والی ہے، وہ بے شک ہوگی، گو اس کا زمانہ ابھی بہت دور ہے۔ وہ اپنے خیال کو ہر کام کے انجام تک دوڑاتا ہے، اور اس کے حال و مآل کے نتیجوں پہ غور کرتا ہے۔ غرض کہ اس کی تمام تدبیریں عمدہ ہوتی ہیں۔ اس کا رویہ ایسے شخص کی مانند ہوتا ہے جو اپنا فائدہ بھی سمجھتا ہے اور اس کے حاصل کرنے کا مناسب طریقہ بھی جانتا ہے۔

سمجھ، جس کو میں نے اس مضمون میں بطور ایک نیکی اور کمال کے بیان کیا ہے، وہ صرف دنیا ہی کے کاموں کے لئے مفید نہیں ہے، بلکہ ہماری ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لئے بھی فائدہ مند ہے۔ حقیقت میں یہی چیز سب سے بڑی ہے۔ اس کے فائدے بے انتہا ہیں؛ اور پھر اس کا ہاتھ آنا نہایت ہی آسان ہے۔

ایک مصنف کا قول ہے کہ:

"سمجھ ہی ایسی رونق کی چیز ہے جس کو کبھی زوال نہیں۔ جو اس کو چاہتے ہیں آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں، جو اس کو ڈھونڈتے ہیں، وہ آسانی سے پاتے ہیں۔ اس کی تلاش میں اُن کو بہت دور جانا نہیں پڑتا، کیونکہ وہ اس کو اپنے ہی دروازے پر پاتے ہیں۔ اس کا خیال رکھنا ہی اس میں کمال حاصل کرنا ہے۔ جو کوئی اس کا خیال رکھتا ہے اسی دم جستجو سے چھوٹ جاتا ہے؛ کیونکہ وہ خود ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہے، اور جو اس کے لائق ہیں، ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔"

قومی اتفاق

مندرجہ ذیل مقالہ، اُن دنوں تہذیب الاخلاق بند ہونے کے باعث، درج نہیں ہو سکا تھا، مگر افاداتِ سرسیدؒ، کا جُزوِ لا ینفک اور ان کے مشن کا سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ (مرتب)

قوم کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کسی قدر غور کرنی لازم ہے۔ زمانۂ دراز سے جس کی ابتداء تاریخی زمانہ سے بھی بالاتر ہے، قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے، یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے ہوتا تھا۔

محمد رسول اللہ صلعم بابی انت و اُمّی نے اس تفرقۂ قومی کو، جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا، مٹا دیا اور ایک روحانی رشتۂ قومی قائم کیا جو ایک حبل المتین:

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

سے مضبوط تھا۔ تمام قومی سلسلے، تمام قومی رشتے، سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہو گئے؛ اور ایک نیا روحانی بلکہ خدائی قومی رشتہ قائم ہو گیا۔

اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک؟ وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا؟ وہ چین کا باشندہ ہے یا ماچین کا؟ وہ پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان میں؟ وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے کا؟ بلکہ جس کسی نے عروۃ الوثقیٰ کلمۂ توحید کو مستحکم پکڑا وہ ایک قوم ہو گیا! بلکہ ایک روحانی باپ کا بیٹا!! کیونکہ خدا نے خود فرمایا ہے:

انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون ط

کون شخص ہے جو دو بھائیوں کو ایک باپ کا بیٹا نہیں جانتا؟ پھر جبکہ خود خدا نے

تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی فرمایا ہے تو ہم سب کا ایک روحانی باپ کی اولاد ہونے میں کیا شک رہا ہے؟

مجھے اس بات کے دیکھنے سے نہایت افسوس ہے کہ ہم سب آپس میں بھائی تو ہیں مگر مثل برادرانِ یوسفؑ کے ہیں۔ آپس میں دوستی اور محبت، یک دلی اور یک جہتی بہت کم ہے۔ حسد، بغض و عداوت کا ہر جگہ اثر پایا جاتا ہے، جس کا نتیجہ آپس کی نااتفاقی ہے۔ شیطان، جس نے خدا سے وعدہ کیا کہ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ، ایک مقدس اور بظاہر نہایت نورانی حیلے سے آپس میں بھائیوں کے، جنکو کہ خدا نے بھائی بنایا ہے، نفاق ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے؛ اور جس طرح کہ ہمارے باپ حضرت آدمؑ، اس کے دھوکے کو خالص دوستی سمجھ کر، دھوکے میں آ گئے۔ اسی طرح ہم بھی اس کے دھوکے میں آجاتے ہیں، اور اس نفاق کو، جو ہر حالت میں مردود ہے، ایک مقدس لباس پہناتے ہیں، یعنی "مذہبی مقدس لباس کا خلعت" اسے عنایت کرتے ہیں۔

کون شخص ہے جو اس بات کو نہیں جانتا ہے:

مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَهُوَ مُسْلِمٌ۔ مَنِ اسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا فَهُوَ مُسْلِمٌ وَمَنْ هُوَ مُسْلِمٌ فَهُوَ اَخٌ۔

امام اعظمؒ کا مذہب مشہور ہے:

لَا نُكَفِّرُ اَهْلَ الْقِبْلَةِ۔

باینہمہ فروع مسائل میں اختلاف ہونے کے سبب کس طرح ہماری قوم نے اس حبل المتین کی بندش کو توڑا ہے، اور اس رشتۂ اخوت کو، جسے خود خدا نے قائم کیا تھا، چھوڑا ہے۔ جس قصبہ اور شہر میں جاؤ، جس مسجد اور امام باڑے میں گزرو، باہم مسلمانوں کے، شیعہ و سُنّی، وہابی و بدعتی، لامذہب و مقلد ہونے کی بنا پر آپس میں نفاق و عداوت پاؤ گے۔

ان نااتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔

جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے۔ قومی ہمدردی، اور قومی ترقی، اور قومی امور کے سرانجام میں اس نالائق نااتفاقی نے بہت کچھ اثرِ بد پہونچایا ہے۔ پس ہماری قومی ترقی کا سب سے اوّل مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اُس عداوت و نفاق کو، یکتائی و یک جہتی سے مبدّل کریں۔

یکتائی و یک جہتی سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقاید کو چھوڑ کر ایک عقیدے پر قائم ہوجاویں۔ یہ امر تو قانون قدرت کے برخلاف ہے، جو ہو نہیں سکتا، نہ تو پہلے کبھی ہوا، اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔

اتفاق کے قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے ایک اور عقلی و نقلی راہ ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ انسان جب اپنی ہستی پر نظر ڈالے گا تو اپنے میں دو حصے پاوے گا: ایک حصہ خدا کا؛ اور ایک حصہ اپنے ابنائے جنس کا۔ انسان کا دل یا اس کا اعتقاد، یا مختصر طور سے یوں کہو کہ اس کا مذہب، خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں؛ اس کے عقاید کی جو کچھ بھلائی یا بُرائی ہو، اس کا معاملہ اس کے خدا کے ساتھ ہے؛ نہ بھائی اُس میں شریک ہے، نہ بیٹا، نہ دوست، نہ آشنا، اور نہ قوم۔ پس ہم کو اس بات سے، جس کا اثر ہر ایک کی صرف ذات تک محدود ہے اور ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے، کچھ بھی تعلق رکھنا نہیں چاہیئے۔ ہم کو کسی شخص سے اس خیال پر کہ وہ شیعہ ہے یا سُنّی، وہابی ہے یا بدعتی، لامذہب ہے یا مقلّد، یا نیچری، یا اس سے کسی بدتر لقب کے ساتھ ملقّب ہے، جبکہ وہ خدا و خدا کے رسُول کو برحق جانتا ہے، کسی قسم کی عداوت و مخالفت رکھنی نہیں چاہیئے، بلکہ اس کو بھی بھائی اور کلمہ کا شریک سمجھنا اور اس اخوّت کو، جس کو خدا نے قائم کیا ہے، قائم رکھنا چاہیئے۔

نہایت افسوس اور نادانی کی بات ہے کہ ہم کسی سے ایسے امر میں عداوت رکھیں جس کا اثر خود اسی تک محدود ہے، اور ہم کو اس سے کچھ بھی ضرر و نقصان نہیں۔ جو حصہ کہ انسان میں اُس کے ابنائے جنس کا ہے اس سے ہم کو غرض رکھنی چاہیئے، اور

رہ سنہ آپس کی محبت، باہمی دوستی، ایک دوسرے کی اعانت، ایک دوسرے کی ہمدردی ہے جس کے مجموعہ کا نام قومی ہمدردی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے خدا کے حکم کی بھی اطاعت اور آپس میں برادرانہ برتاؤ، قومی اتفاق، قومی ہمدردی قائم ہو سکتی ہے جو قومی ترقی کے لئے پہلی منزل ہے۔

یہ بات ہم کو بھولنی نہیں چاہیئے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں گو وہ ہمارے ساتھ اس کلمہ میں، جس نے ہم مختلف قوموں اور مختلف فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنایا ہے، شریک نہیں ہیں، مگر بہت سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ، مثل بھائیوں کے، شریک ہیں۔ ہمسایہ کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے، اور یہی ہمسائگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی اور ہموطنی کی وسعت تک پہونچ گئی ہے۔

ان ہموطن بھائیوں میں بھی دو حصے ہیں، ایک خدا کا اور ایک ابنائے جنس کا: خدا کا حصہ خدا کے لئے چھوڑ دو، اور جو حصہ ان میں ابنائے جنس کا ہے اس سے غرض رکھو! تمام امور انسانیت میں جو تمدن و معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں ایک دوسرے کے مددگار رہو! آپس میں سچی محبت، سچی دوستی اور دوستانہ برتاؤ جاری رکھو!

اتفاق کی خوبیاں لوگوں نے بہت کچھ بیان کی ہیں، اور وہ ایسی ظاہر ہیں کہ کوئی شخص اتفاق سے بھی ان کو بھول نہیں سکتا۔ بہت بڑے بڑے واقعات دنیا میں گزرے ہیں، جن کو پرانی تاریخیں یاد دلاتی ہیں؛ اور جن کی یاد سے ایک عجیب اثر ہمارے دلوں میں ہوتا ہے، وہ سب باہمی اتفاق کا نتیجہ ہے۔ ایک ناچیز ریشۂ گیاہ جو تنہا نہایت کمزور ہوتا ہے باہمی اتفاق سے ایسا قوی اور زبردست ہو جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس وقت تعلیم یافتہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہے، یا نامہذب ملکوں میں جو کچھ طاقت ہے وہ سب اتفاق کی بدولت ہے۔

بعض قابلِ ادب بزرگوں کا قول ہے کہ جس طرح اصلی دوستی دنیا میں ناپید ہے، اسی طرح آپس کا اتفاق بھی ناممکن ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ تمام انسانوں کی طبائع اور اُن کے اغراض مختلف ہیں، اور جبکہ اغراض مختلف ہیں تو ضرور ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے مخالف ہوں۔ کوئی قوم مہذب یا نامہذب ایسی نہیں پائی جاوے گی جس میں باہم حسد و نفاق، عداوت اور باہمی حقارت نہ پائی جاتی ہو۔ ہاں! یہ بات سچ ہے۔ مگر جس اتفاق پر ہم بحث کرتے ہیں وہ شخصی اتفاق نہیں ہے بلکہ قومی اتفاق ہے! ہمارے آپس میں بمقتضائے بشریت گو کیسا ہی نفاق ہو، جو خدا کے نزدیک ایک سخت گناہ ہے، مگر وہ قومی اتحاد اور قومی اتفاق کا مانع نہیں ہے۔ قومی بھلائی یا قومی بُرائی کا اثر تمام قوم کے لوگوں پر پہونچتا ہے، اس لئے جلب منفعت یا دفع مضرت میں سب لوگ متفق ہو جاتے ہیں اور شخصی تنازعات کا اس وقت کچھ اثر باقی نہیں رہتا ہے۔

اس زمانہ میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزل کا ہے وہ یہی ہے کہ ہم میں قومی اتفاق کا خیال نسیًا منسیا ہو گیا ہے۔ کسی کو بجز ذاتی منفعت کے، قومی بھلائی یا قومی منفعت کا خیال بھی نہیں آتا ہے۔ اگر کوئی کچھ کرتا بھی ہے تو اس کو پہلے اپنی ذاتی غرض مدنظر ہوتی ہے اور قومی بھلائی کے پردے سے اس کی پردہ پوشی کرنی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں برکت نہیں ہوتی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری قوم میں نیکی کا خیال نہیں ہے۔ نہیں! اُن میں بہت کچھ نیکی ہے اور بہت سے نیک کام ان سے ہوتے ہیں۔ کیسی کیسی عالیشان مسجدیں، کیسے کیسے عالیشان امام باڑے، کیسی کیسی نفیس خانقاہیں ان کی نیکی کی یادگاریں موجود ہیں۔ اب بھی ہر شہر اور قصبے میں دیکھو گے کہ لوگ کس قدر خیر خیرات کرتے ہیں۔ بھوکوں کو کھلاتے ہیں۔ حج و زیارت میں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ مسجدیں بنواتے ہیں۔ کوئی ایسا کام جس میں ان کی دانست میں مذہبی نیکی ہو دل و جان سے اس میں مصروف ہوتے ہیں۔ سب لوگ قبول کریں گے کہ اس نیت سے یہ کام کئے جاتے ہیں کہ قیامت میں ان کو اس کا بدلہ ملے گا اور روزِ حشر میں ان کو ثواب حاصل ہو گا۔

اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو درحقیقت یہ سب کام خود غرضی اور ذاتی منفعت کے ہیں، نہ ابنائے جنس کی بھلائی اور قومی ہمدردی کے! جب تک کہ ہمارے دل میں یہ جوش نہ پیدا ہو کہ جو کام ہم کریں وہ قوم کے لئے کریں، نہ اپنے ثواب آخرت کے لیے، اس وقت تک قومی ہمدردی کا جوش پیدا نہیں ہو سکتا۔

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ان ثواب کے کاموں کو برا جانتا ہوں یا ان کی کچھ حقارت کرتا ہوں۔ بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ میں اصلی قومی ہمدردی کو ذہن نشین کرنے پر کوشش کروں اور دوسرے کاموں سے جو امتیاز ہے اس کو بتلاؤں۔

محبّت

فرض کرو کہ کوئی شخص کسی سے محبت رکھتا ہے، ہم اس سے سوال کرتے ہیں کہ:
"تم اس سے کیوں محبت رکھتے ہو؟"
وہ اس کا جواب دیتا ہے کہ:
"وہ میرا بڑا محسن ہے۔ اس نے بڑے مشکل وقتوں میں مجھ پر احسان کئے ہیں: تنگی کے وقت روپیہ سے مدد کی ہے؛ بیماری کی حالت میں میری تیمارداری کی ہے؛ دوا دارو، علاج معالجہ میں بڑی کوشش کی ہے۔"
یا وہ اس کا یوں جواب دیتا ہے کہ:
"ہم اور وہ مدت تک ساتھ رہے ہیں؛ دن رات آپس میں اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا ساتھ رہا ہے: روز روز کی ملاقات، بات چیت، ہنسی مذاق، دل لگی، مزاج کی باہمی موافقت کے سبب آپس میں دوستی و محبت ہو گئی ہے۔"
یا وہ کہتا ہے کہ:
"جس فن کا مجھ کو شوق ہے، اس فن کا اس کو بدرجہ غایت کمال ہے۔ اس فن کے کمال کے سبب جس کا مجھکو شوق ہے، اس شخص سے دلی محبت اور جانی دوستی ہو گئی ہے۔"
یا اس کا سبب وہ یہ بتلاتا ہے کہ:
"وہ شخص نہایت خوبصورت ہے۔ اس کے حسن و جمال نے میرے دل میں اس کی محبّت بلکہ اس کا عشق پیدا کر دیا ہے۔"

پھر ہم اس سے دوسرا سوال کرتے ہیں، اور کسی بزرگ کا بزرگانِ دین میں سے نام لیتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ:

"تم ان بزرگ سے بھی محبت رکھتے ہو؟"

وہ ضرور جواب دیتا ہے کہ:

"ہاں کیوں نہیں؟"

تب ہم اس سے کہتے ہیں کہ:

"وہ بزرگ تو تم سے کئی سو برس پہلے گزر چکے ہیں۔ انہوں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، کسی مشکل کے وقت تمہارے کام نہیں آئے۔ کبھی تنگی کے وقت میں تم کو کچھ نہیں دیا۔ کبھی تمہاری تیمارداری نہیں کی، کبھی تمہاری دوا درمن علاج معالجہ میں کوشش نہیں کی۔ کبھی وہ اور تم ساتھ نہیں رہے۔ نہ کبھی ساتھ اٹھے بیٹھے۔ نہ کبھی آپس میں ملاقات بات چیت ہوئی۔ نہ کبھی ہنسی مذاق ہوا۔ نہ کبھی باہم مزاجی موافقت ہوئی۔ جس فن کا تم کو شوق ہے، وہ اس کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ نہ تم نے ان کو دیکھا کہ ان کے حُسن وجمال نے تم کو فریفتہ کر لیا ہو۔ پھر کیوں تم ان سے محبت رکھتے ہو؟"

اس سوال کا، وہ نہایت ناراض ہو کر اور لال منہ کر کے، غصہ بھری آواز سے جواب دیتا ہے کہ:

"میاں! وہ بزرگانِ دین تھے۔ خدا کے ہاں ان کا بڑا درجہ ہے۔ وہ دین داری میں یگانۂ وقت تھے۔ ایمان کامل ان کو نصیب تھا۔ دین میں سب کے سردار تھے۔ اس لئے اُن سے محبت رکھتے ہیں۔"

اب میں بتاتا ہوں کہ یہی پچھلی محبت، محبت من حیث الدین ہے، جس کو میں حُبِ ایمانی کہتا ہوں! اور یہی محبت غیر مذہب سے رکھنی شرعاً ممنوع اور حرام بلکہ کفر ہے! اور پہلی محبت، جس کو میں حُبِ انسانی کہتا ہوں، شرعاً ممنوع نہیں۔

دونوں قسم کی محبت میں بالبداہت تفرقہ و تمیز موجود ہے: کہ ایک قسم کی محبت اُن اسباب ظاہری کے باعث تھی جو بمقتضائے فطرتِ انسانی ایک کو دوسرے کے ساتھ پیدا ہو جاتے ہیں؛ اور دوسری قسم کی محبت، باوجود معدوم ہونے ان تمام اسباب ظاہری کے، من حیث الدین تھی۔ اب کون شخص ہے جو ان دونوں قسم کی محبت میں تمیز نہیں کر سکتا؟

پس، جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غیر مذہب والوں سے سچی دوستی اور دلی محبت کرنا ممنوع ہے، یہ اُن کی غلطی ہے۔ جو چیز کہ خدا تعالےٰ نے انسان کی فطرت میں بنائی ہے، وہ برحق اور بالکل سچ ہے۔ ہم کو تمام دوستوں سے، خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی اور برتنی چاہیئے؛ مگر وہ تمام محبت اور دوستی حُبِ انسانی کے درجہ میں ہو نہ حُبِ ایمانی کے؛ کیونکہ حُبِ ایمانی بلا اتحاد مذہب بلکہ بلا اتحاد مشرب، ہونی غیر ممکن ہے؛ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہدایت ہم کو ہمارے سچے مذہب اسلام نے کی ہے:

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم،
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس۔

ہمدردی

کیا دھوکے کی چیز ہے ! کیا بھلاوے میں پڑے ہیں ! جو سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی مصیبت میں مدد کرنا، ہمدردی کرنا ہے۔ کیا ہم اُس فائدے میں شریک نہیں؟ نہیں! بے شک واسطہ، یا بلا واسطہ، یا واسطہ در واسطہ شریک ہیں! پھر دوسرے کی مدد کرنا کہاں رہا، بلکہ آسائش کے وسیلہ سے اپنی مدد آپ کرنا ہوا۔ اس لئے جو لوگ ہمدردی کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اپنی آپ مدد کرتے ہیں؛ اور جو نہیں کرتے، وہ خود اپنی آسائش کے وسیلہ کو نقصان پہونچاتے ہیں۔

ہمدردی کا لفظ ہمارے خیال کو ایسی امداد کی طرف لے جاتا ہے جو رنج و مصیبت کی حالت میں ہو؛ لیکن اگر ہم مصیبت کے لفظ کی اصلی مراد پر غور نہ کریں، تو ضرور غلطی میں پڑیں۔ عام مفہوم مصیبت کا جو اس لفظ سے ہماری سمجھ میں آتا ہے کوئی مستقل مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک نسبتی مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ جو چیز کہ ایک کے لئے مصیبت ہو، ممکن ہے کہ دوسرے کے لئے مصیبت نہ ہو۔ وہ عادت و استعمال سے ایسی مختلف ہو جاتی ہے کہ مصیبت نہیں معلوم ہوتی۔ وہ کسی جوش کے سبب سے ایسی بدل جاتی ہے کہ بالکل راحت سمجھ میں آتی ہے۔ بے شک، یہ تمام مفہوم نسبتی ہیں؛ اور جو اصلی مفہوم ہے، وہ ایسی حالت کا ہونا، یا واقع ہونا ہے، جو قدرتی فرحت اور راحت کے برخلاف ہو۔

اس حالت کا ہونا، غیر اختیاری حالتوں کا ہونا ہے؛ اور واقع ہونا، اختیاری حالتوں کا۔ مگر پچھلی حالت، اگر نتیجہ کی لاعلمی یا نقصانات غیر متعدی کے سبب سے ہے تو مجازاً وہ پہلی ہی سی ہے، ورنہ حقیقت میں وہ مصیبت نہیں بلکہ سزا

ہے، اور اس لئے اس میں ہمدردی نہیں! پس اصلی یا اصلی سی مصیبت میں کسی کی مدد کرنا البتہ سچی ہمدردی ہے۔

رحم اور موانست اور ہمدردی شاید نتیجہ میں متحد ہوں، مگر ہر ایک کا منشاء مختلف ہے۔ رحم ایک فطرتی نیکی ہے جو ہم جنس اور غیر ہم جنس دونوں کے ساتھ برتی جاتی ہے! موانست کا اثر صرف ہم جنسوں میں پایا جاتا ہے۔ ہمدردی جو عقل کے نتیجوں میں سے ہے، ذی عقل ہی میں ہو سکتی ہے، اور اس لئے صرف انسان ہی میں منحصر ہے۔ پس جس میں ہمدردی نہیں، اس کی انسانیت میں نقصان ہے۔

قدرتی قاعدے کے مطابق ہمدردی کے، بقدر تفاوت اپنی آسائش کے وسیلوں کے، متفاوت درجے ہیں۔ جس طرح کہ باپ، بھائی، جورو، بچے، پھر اور درجہ بدرجہ کے رشتہ مند، پھر اپنے ملک کے، پھر اپنے ہم سایہ ملک کے، پھر اس سے دور کے ملک کے باشندے درجہ بدرجہ ہماری آسائش کے وسیلے ہیں۔ اسی طرح اس قادر مطلق کی کامل قدرت نے ہمدردی کے رشتہ کی مضبوطی اور استواری کو بھی درجہ بدرجہ بنایا ہے۔ باپ کو بیٹے سے جو جوش ہمدردی ہے، وہ پوتے سے نہیں، اور جو پوتے سے ہے، وہ پڑپوتے سے نہیں۔ اسی طرح یہ رشتہ جتنا کہ بڑھتا جاتا ہے، اتنا ہی گھٹتا جاتا ہے! اور جب وہ اپنے ملک، یا اپنے ہم سایہ ملک، یا اس سے دور کے ملک تک پہونچتا ہے، تو اور بھی پتلا ہو جاتا ہے۔

بعضے کہتے ہیں کہ یہ ایک دھوکا ہے! اور اگر یہ دھوکا نہیں ہے، اور یہ متفاوت درجے قدرتی ہیں، تو انجان بیٹے، اور ان پہچان باپ میں کیوں وہ ہمدردی نہیں؟ حقیقت میں یہ صرف ایک خیال ہے جس سے موانست پیدا ہوتی ہے، اور وہی باعث ہمدردی ہے۔ نفرت، جو اس کی ضد ہے، اس کا بخوبی ثبوت فراہم کرتی ہے کہ جب وہ پیدا ہوتی ہے، تو باوجود موجود ہونے قدرتی رشتہ کے، کچھ بھی ہمدردی نہیں رہتی۔

بے شک ایسا، یا ایسا سا، ہوتا ہے، مگر اس میں کچھ غلطی بھی ہے۔ قریب رشتہ والا بہ نسبت دور کے رشتہ والے کے بلا شبہہ ہم سے زیادہ تر جزئیت رکھتا ہے! اور اسی

طرح بعید بہ نسبت اَبعَدُ کے۔ پھر اگر وہ جزئیت قدرتی ہے، تو ہمدردی بھی قدرتی ہے۔ ہاں موانست اس کو نہایت تیز کر دیتی ہے؛ اور کبھی ایسی جو قدرتی سی معلوم ہوتی ہے، انجان بیٹے اور ان پہچان باپ میں جو وہ چمکتی نہیں، نہ اسلئے کہ وہ نہیں ہے، بلکہ اس لئے کہ اُن میں انسانیت کا ایک بڑا اجزو جو علم یعنی دانستن ہے، نہیں ہے۔

قریبوں سے ہمدردی نہ کرنی نہایت بدخصلت قابل سزا کے ہے، اس لئے کہ قدرت کے نہایت مستحکم قاعدے کو توڑنا ہے؛ اور کرنی کچھ بڑی صفت نہیں، کیونکہ قدرت نے اس کے کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ بعیدوں سے ویسی نہ کرنی کچھ سخت مذمت نہیں، اسلئے کہ قدرت کے کسی مستحکم قاعدہ کی برخلافی نہیں؛ اور کرنی نہایت عمدہ صفت ہے، کیونکہ قدرت کے منشاء کا بدرجۂ اتم کامل کرنا ہے۔

افسوس ہے کہ عمدہ صفت کبھی دھوکا کھا کر معیوب کٹی کر دی جاتی ہے، جبکہ پہلی کو ادنےٰ صفت سمجھ کر چھوڑتے ہیں، اور دوسری کو اعلیٰ صفت سمجھ کر پکڑتے ہیں۔ مگر پہلی کے چھوڑنے کی بُرائی، دوسری کی بھلائی کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ پس سچی ہمدردی وہی ہے جو قدرت کے قانون کے مطابق اور قدرت کے منشار کی تکمیل کے لئے ہو۔

کانشنس یا ضمیر

کانشنس، یعنی وہ قوتِ ممیزہ جو خدا نے ہر ایک انسان کے دل میں پیدا کی ہے، اور جو نیک اور بد کاموں میں تمیز کرتی ہے، انسان کے لئے سچی ہادی اور پیغمبر ہے۔

یہ مسئلہ وہ ہے جس پر اس زمانہ کے آزاد منش اور انسان کو مختار اپنے افعال کا ماننے والے اپنے مذہب یا مشرب کا اصل اصول قرار دیتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ مسئلہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔ کیا کانشنس کوئی ایک جدا قوت ہے جو انسان میں جداگانہ اسکی ہدایت کے لئے خدا نے پیدا کی ہے؟ حالانکہ اس کا کچھ ثبوت نہیں، اور اگر فرض بھی کر لیں، تو اس سے کوئی نتیجہ سچی ہدایت اور اصلی رہنمائی کا نہیں۔

کانشنس نہایت عمدہ چیز ہے، اور انسان کو برائی سے بچانے اور بھلائی کیطرف راغب کرنے کو بہت اچھا رہنما! مگر درحقیقت وہ ایک حالت انسان کی طبیعت کی ہے، اور اس کی طبیعت کا ایک نتیجہ ہے۔ پس فی نفسہٖ وہ کوئی چیز نہیں! بلکہ تربیت سے، یا خیالات سے جو کیفیت انسان کی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے، اسکا یہ نام ہے۔

اگر فی الواقع وہ ایک قوت رہنمائی کے لئے بمنزلہ ایک پیغمبر کے انسان میں ہو، تو ضرور ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لیے یکساں رہنما ہو! یعنی جس بات کو ایک انسان نیک سمجھے، اسی کو تمام انسان نیک سمجھیں! اور جس بات کو ایک انسان بد جانے، وہ سب انسانوں کے نزدیک بد ہو۔ مگر کانشنس انسانوں کو مختلف بلکہ متضاد، بلکہ نقیض باتوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور وہ دونوں سچی ہدائتیں نہیں ہو سکتیں۔

اس شبہہ کی نسبت کہ اُن متناقض کانشنسوں میں سے ایک غلط اور صرف

دھوکا ہوگا، "ہنری طامس بکل" نے نہایت عمدہ بات کہی ہے کہ:

"ایسی حالت میں ہم پوچھیں گے کہ وہ کونسی چیز ہے، جو صحیح اور غلط یا اچھی اور جھوٹی کانشنس دیں تمیز کرتی ہے؟"

یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر ایک انسان فی نفسہٖ ایک جُداگانہ مخلوق ہے؛ اور ہر ایک کا پیغمبر، یعنی کانشنس خود، اس کے ساتھ ہے، اور اس لئے مجموعی اتحاد کانشنس کی کچھ ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہر ایک کو اپنے پیغمبر کی ہدایت پر چلنا چاہیئے۔ تو یہ کہنا بہت درست نہ ہوگا، کیونکہ ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوا ہے کہ کانشنس درحقیقت ایک جُداگانہ مخلوق قوّت، انسان کی رہنمائی کے لئے ہے؛ بلکہ ابھی تک جو معلوم ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ طبیعت کی ایک حالت ہے، اور اگر یہ بات ہے تو بقول مسٹر "بکل" کے، بحث ختم ہوگئی۔

علاوہ اس کے، جبکہ ہر ایک کا کانشنس اس کا رہنما پیغمبر ٹھہرا، اور ایک دوسرے کے کانشنس میں اختلاف و تناقض کا وجود بالیقین پایا گیا، تو ان دونوں کا صحیح ہونا بھی، جو ایک دوسرے کی نقیض ہیں، ضرور ماننا پڑے گا۔ شاید ان کا تناقض نسبت یا حیثیت کی مدد سے رفع کیا جاوے گا؛ اور یوں کہا جاویگا کہ رام دین کا مہادیو کی مورت کو پوجنا اس لئے نیک ہے کہ اس کا "کانشنس" اس کو نیک بتاتا ہے؛ اور محمود غزنوی کا سومنات کے بُت کو توڑنا اس لئے نیک ہے کہ اس کا "کانشنس" اس کو نیک بتاتا ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ دنیا میں درحقیقت نیک و بد کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ صرف خیال ہی ہے۔

کوئی اہلِ مذہب تو، یہودی ہو یا عیسائی، مسلمان ہو یا ہندو، بُدھِسٹ ہو یا برھمو، اس بات کو تسلیم نہیں کرنے کا۔ باقی رہا دہریّہ، وہ بھی اس کو قبول نہیں کرسکتا؛ کیونکہ بالفرض، اگر ثواب و عقاب ایک شے معدوم ہو، تو بھی خود دہر ہی اس دنیا میں ہم کو وہ باتیں بتاتا ہے جو کرنے اور نہ کرنے کے قابل ہیں، اور انہی کو ہم دوسرے لفظوں میں نیک و بد سے، یا ممنوع و جائز سے تعبیر کرتے ہیں۔

قطع نظر اس کے، اگر ایک شخص کا کانشنس ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتا تو بھی یقین ہو سکتا کہ اس کا پیغمبر اس میں ہے! مگر وہ ایک حالت پر بھی نہیں رہتا۔ عمر کے لحاظ سے، تجربہ کی ترقی سے، صحت کے اثر سے، معلومات کے بڑھنے سے، خیالات کے تبدیل ہونے سے بالکل بدلتا رہتا ہے۔ مسلمان کا عیسائی ہونے پر، عیسائی کا مسلمان ہونے پر، ہندو مسلمان عیسائی کا برھمو ہونے پر، برھمو کا دہریہ ہونے پر، کانشنس بالکل بدل جاتا ہے، اور وہ پہلے کو جس کی سچائی پر یقین کامل رکھتا تھا؛ بالکل غلط اور جھوٹا سمجھتا ہے۔

پس یہ صاف دلیل اس بات کی ہے کہ انسان کا کانشنس اسکا پیغمبر اور سچا رہنما نہیں ہو سکتا۔ بقول مسٹر "بکل" کے کہ "اگر بعض باتوں میں کانشنس ہمکو دھوکا دیتا ہے، تو کیونکر یقین ہو سکتا ہے کہ اور باتوں میں دھوکا نہ دیگا؟" پس صحیح اور غلط کانشنس میں تمیز کرنے کو، دوسری کسی چیز کا ہونا لازم ضرور ہے۔ یا، اس مطلب کو یوں ادا کرو کہ ہمارے لئے کسی ایسی دوسری چیز کا ہونا ضرور ہے، جسکے سبب ہمارا کانشنس یعنی ہماری طبیعت کی حالت ایسی ہو جاوے کہ ہماری سچی رہنما اور بمنزلہ سچے پیغمبر کے ہو۔

اس بیان سے جو ظاہر ا بالکل سیدھا اور صاف ہے، اور کج پیچ اس میں کچھ نہیں ہے، اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ کانشنس فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے! اور نہ وہ ابتدائً کسی مذہب کا اصل اصول قرار پانیکے لائق ہے؛ اور نہ فی حد ذاتہ رہنما ہونے کا مستحق ہے۔ ہاں بلاشبہ! جبکہ سچے اصول پر انسان کی طبیعت تربیت پا جاوے، یا سچے خیالات سے اسکی طبیعت موثر ہو جاوے، اور طبیعت اس سچائی مطابق حالت پیدا کرلے، تب وہ "حالتِ طبیعت" یعنی کانشنس، انسان کا محافظ اور انسان کا رہنما ہوتا ہے۔

ہم ہمیشہ اپنی تحریروں میں جہاں کانشنس کا استعمال کرتے ہیں، اور جسکو ہم ہادی یا محافظ یا گناہوں کا بخشانے والا کہتے ہیں، اور جس کو ہم شرعی زبان میں "توبہ" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، وہاں ہماری مراد اسی کانشنس سے ہے۔

آزادیٔ رائے

رائے کی آزادی ایک ایسی چیز ہے کہ ہر ایک انسان اس پر پورا پورا حق رکھتا ہے۔ فرض کرو کہ تمام آدمی، بجز ایک شخص کے کسی بات پر متفق الرائے ہیں؛ مگر صرف وہی ایک شخص ان کے برخلاف رائے رکھتا ہے، تو ان تمام آدمیوں کو اس ایک شخص کی رائے غلط ٹھہرانے کے لئے اس سے زیادہ کچھ استحقاق نہیں ہے، جتنا کہ اس ایک شخص کو اُن تمام آدمیوں کی رائے کے غلط ثابت کرنے کا، اگر وہ ثابت کر سکے، استحقاق حاصل ہے۔

کوئی وجہ اس بات کی نہیں ہے کہ پانچ آدمیوں کو تو بمقابلہ چار آدمیوں کی رایوں کے غلط ٹھہرانے کا استحقاق ہو، اور ایک آدمی کو بمقابل نو آدمیوں کے یہ استحقاق نہ ہو۔ رائے کی غلطی آدمیوں کی تعداد کی کمی بیشی پر منحصر نہیں ہے، بلکہ قوتِ استدلال پر منحصر ہے۔ جیسے کہ یہ بات ممکن ہے کہ ۹ نو آدمیوں کی رائے بمقابلہ ایک شخص کے صحیح ہو، ویسے ہی یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کی رائے بمقابل ۹ نو کے صحیح ہو۔

رایوں کا بند رہنا، خواہ بسبب کسی مذہبی خوف کے، اور خواہ بسبب اندیشہ برادری و قوم کے، اور خواہ بدنامی کے ڈر سے، اور یا گورنمنٹ کے ظلم سے، نہایت ہی بُری چیز ہے۔ اگر رائے اس قسم کی کوئی چیز ہوتی، جس کی قدر و قیمت صرف اس رائے والے کی ذات ہی سے متعلق اور اسی میں محصور ہوتی، تو رایوں کے بند رہنے سے ایک خاص شخص کا یا معدودے چند کا نقصان متصور ہوتا؛ مگر رایوں کے بند رہنے سے تمام انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے، اور کُل انسانوں کو نقصان پہونچتا ہے، اور نہ صرف موجودہ انسانوں کو، بلکہ ان کو بھی جو آئندہ پیدا ہوں گے۔

اگرچہ رسم و رواج بھی ان کے برخلاف رایوں کے اظہار کے لئے ایک بہت قوی مزاحم کار گنے جاتے ہیں؛ لیکن مذہبی خیالات، مخالف مذہب رائے کے اظہار اور مشتہر ہونے کے لئے نہایت اقوی مزاحم کار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ اس مخالف رائے کا ظاہر ہونا، ان کو ناپسند ہوا ہے، بلکہ اسی کے ساتھ جوش مذہبی اُمنڈ آتا ہے اور عقل کو سلیم نہیں رکھتا؛ اور اس حالت میں اُن سے ایسے افعال و اقوال سرزد ہوتے ہیں، جو انہیں کے مذہب کو جس کے وہ طرف دار ہیں، مضرت پہونچاتے ہیں۔

وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ مخالفوں کے اعتراض لامعلوم رہیں؛ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ بسبب پوشیدہ رہنے ان اعتراضوں کے، انہیں کے مذہب کے لوگ ان کے حل پر متوجہ نہ ہوں، اور مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیق کئے اور بلا دفع کئے باقی رہ جاویں؛ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ ان کی آئندہ نسلیں، بسبب ناتحقیق رہ جانے ان اعتراض کے جس وقت ان اعتراضوں سے واقف ہوں، اسی وقت مذہب سے منحرف ہو جاویں؛ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتے ہیں، کہ اس مذہب کو جس کے وہ پیرو ہیں، مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت ہی اندیشہ ہے۔ اگر انہی کے مذہب کا کوئی شخص بغرض حصول اغراض مذکورہ ان کو پھیلانا چاہتا ہے، تو اس کو معترض کی جگہ تصور کرتے ہیں، اور اپنی نادانی سے دوست کو دشمن قرار دیتے ہیں۔

کیا عمدہ رائے ایک فیلسوف کی ہے کہ:

"کسی رائے کے حامیوں کا اس رائے کے برخلاف رائے کے مشتہر ہونے میں مزاحمت کرنے سے، خود ان حامیوں کا بہ نسبت ان کے مخالفوں کے زیادہ تر نقصان ہے؛ اس لئے کہ اگر وہ رائے صحیح و درست ہو، تو اس کی مزاحمت سے غلطی کے بدلے صحیح بات حاصل کرنے کا موقع اُن کے ہاتھ سے جاتا ہے؛ اور اگر وہ غلط ہے، تو اس بات کا موقع باقی نہیں رہتا

کہ غلطی اور صحت کے مقابلہ سے جو صحت کو زیادہ استحکام اور اس کی سچائی زیادہ تر
دلوں پر مؤثر ہوتی ہے، اور اس کی روشنی دلوں میں بیٹھ جاتی ہے، اس کا
نتیجہ کو حاصل کریں جو فی الحقیقت نہایت عمدہ فائدہ ہے۔"

کچھ شبہہ نہیں ہے کہ عموماً مخالف اور موافق رائیوں کا پھیلنا اور منتشر ہونا، خواہ وہ دینی معاملہ سے علاقہ رکھتی ہوں یا دُنیوی معاملہ سے، نہایت ہی عمدہ اور مفید ہے۔ دونوں قسم کی رائیوں پر جدا جدا غور کرنے کا موقع ملتا ہے کہ ان میں سے کونسی بہتر ہے؛ یا ان دونوں کی تائید ایسے دلائل سے ہوتی ہے جو جداگانہ ہر ایک کے مناسب ہیں۔ ہم کو اس بات کا کبھی یقین کامل نہیں ہو سکتا کہ جس رائے کی مزاحمت میں پابند رہنے میں ہم کوشش کرتے ہیں، وہ غلط ہی ہے؛ اور اگر یقین بھی ہو کہ وہ غلط ہے، تو بھی اس کی مزاحمت اور اس کا انسداد بُرائی سے خالی نہیں۔

فرض کرو کہ جس رائے کا بند کرنا ہم چاہتے ہیں، حقیقت میں وہ رائے صحیح و درست ہے؛ اور جو لوگ اس کا انسداد چاہتے ہیں وہ اس کی درستی اور صحت سے منکر ہیں۔ مگر غور کرنا چاہیئے کہ وہ لوگ، یعنی اس رائے کے بند کرنے والے، ایسے نہیں ہیں جن سے غلطی اور خطا ہونی ممکن نہ ہو، تو ان کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اس خاص معاملہ کو تمام انسانوں کے لئے خود فیصل کریں اور اَور شخصوں کو اپنی رائے کام میں لانے سے محروم کر دیں۔

کسی مخالف رائے کی سماعت سے اس وجہ سے انکار کرنا کہ ہم کو اس سے غلط ہونے کا یقین ہے، گویا یہ کہنا ہے کہ ہمارا یقین، یقینِ کامل کا رتبہ رکھتا ہے؛ اور اُس پر بحث و گفتگو کی ممانعت کرنا انبیاء سے بھی بڑھ کر اپنا رتبہ ٹھہرانا ہے؛ اور اپنے تئیں ایسا سمجھنا ہے کہ ہم سے سہو و خطا کا ہونا ناممکن ہے۔

اگرچہ سب اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم سے سہو و خطا ہونی ممکن ہے، مگر بہت ہی کم آدمی ایسے ہوں گے جو اس کا خیال رکھنا اور از روئے عمل کے بھی اس کی احتیاط کرنا ضرور سمجھتے ہوں، اور عملی طور پر اس بات کو تسلیم کرتے ہوں کہ جس رائے کی صحت کا

ان کو خوب یقین ہے، شاید وہ اسی سہو و خطا کی مثال ہو، جس کا ہونا وہ اپنے سے ممکن سمجھتے ہیں۔

جو لوگ کہ دولت، یا منصب اور حکومت، یا علم کے سبب غیر محدود تعظیم و ادب کے عادی ہوتے ہیں، وہ تمام معاملات میں اپنی رایوں کے صحیح ہونے پر یقین کامل رکھتے ہیں، اور اپنے میں سہو و خطا ہونے کا احتمال بھی نہیں کرتے؛ اور جو لوگ ان سے کسی قدر زیادہ خوش نصیب ہیں، یعنی وہ کبھی کبھی اپنی رایوں پر اعتراض اور حجت اور تکرار ہوتے ہوئے سنتے ہیں، کچھ کچھ اس بات کے عادی ہوتے ہیں کہ جب غلطی پر ہوں تو متنبہ ہونے پر اس کو چھوڑ دیں، اور درست بات کو مان لیں، اگرچہ ان کو اپنی ہر ایک رائے کی درستی پر یقین کامل تو نہیں ہوتا، مگر ان رایوں کی درستی پر ضرور یقین ہوتا ہے، جن کو وہ لوگ جو ان کے ارد گرد رہتے ہیں یا ایسے لوگ جن کی بات کو وہ نہایت ادب و تعظیم کے قابل سمجھتے ہیں ان رایوں کو تسلیم کرتے ہیں۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جو شخص جس قدر اپنی ذاتی رائے پر اعتماد نہیں رکھتا، وہ شخص اسی قدر، دنیا کی رائے پر عموماً زیادہ تر اعتماد رکھتا ہے، جس کو بعضی اصطلاحوں میں جمہور کی رائے یا جمہور کا مذہب کہا جاتا ہے؛ مگر یہ بات سمجھنی چاہیئے کہ ایسے لوگوں کے نزدیک دنیا سے یا جمہور سے کیا مراد ہوتی ہے۔ ہر ایسے شخص کے نزدیک دنیا سے اور جمہور سے وہ چند اشخاص محدود مراد ہوتے ہیں، جن سے وہ اعتقاد رکھتا ہے، یا جن سے وہ ملتا جلتا ہے؛ مثلاً، اس کے دوستوں یا ہم رایوں کا فریق، یا اس کی ذات برادری کے لوگ، یا اس کے درجہ و رتبہ کے لوگ۔ پس اس کے نزدیک تمام دنیا اور جمہور کے معنی انہی میں ختم ہو جاتے ہیں، اور اس لئے وہ شخص اس رائے کو دنیا کی یا جمہور کی رائے سمجھ کر اس کی درستی پر زیادہ تر یقین کرتا ہے۔

اس ہیئت مجموعی رائے کا جو اعتماد اور یقین اس کو زیادہ ہوتا ہے، اور ذرا بھی اس میں لغزش نہیں آتی؛ اس کا سبب یہ ہی ہوتا ہے کہ وہ اس بات سے واقف نہیں ہوتا کہ اس زمانہ سے پہلے اور زمانوں کے اور ملکوں کے اور فرقوں کے اور مذہبوں کے

لوگ اس میں کیا رائے رکھتے تھے، اور اب اور ملکوں اور فرقوں اور مذہبوں کے لوگ کیا رائے رکھتے ہیں۔ ایسے شخص کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اس بات کی جواب دہی کو کہ درحقیقت وہ راہ راست پر چلتا ہے اپنی فرضی دنیا یا جمہور کے ذمہ ڈالتا ہے۔

پس جو کچھ اس کی رائے یا اس کا حال ہو کچھ بھی اعتبار اور یقین کے لائق نہیں ہے، اس لئے کہ جن وجوہات سے وہ شخص بسبب مسلمان خاندان میں پیدا ہونے کے اس وقت بڑا مقدس مسلمان ہے۔ انہی وجوہات سے اگر وہ عیسائی خاندان یا ملک، یا بت پرست خاندان یا ملک، میں پیدا ہوتا تو وہ بھلا چنگا عیسائی یا بت پرست ہوتا۔ وہ مطلق اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ جس طرح کسی خاص شخص کا خطا میں پڑنا ممکن ہے، اسی طرح اس کی فرضی دنیا اور خیالی جمہور کی تو کیا حقیقت ہے، زمانہ کے زمانہ کا اور اس سے بھی بہت بڑی دنیا کا خطا میں پڑنا ممکن ہے۔

تاریخ سے اور علوم موجودہ سے بخوبی ظاہر ہے کہ ہر زمانہ میں ایسی ایسی رائیں قائم ہوئیں اور مسلّم قرار پائیں، جو اس کے بعد کے زمانہ میں صرف غلط ہی نہیں بلکہ سراسر لغو و مہمل سمجھی گئیں۔ اور یقیناً اس زمانہ بھی بہت سی ایسی رائیں مروج ہوں گی جو کسی آئندہ زمانہ میں اسی طرح مردود اور نامعقول ٹھہریں گی جیسے کہ بہت سی وہ رائیں، جو اگلے زمانہ میں عام طور پر مروج تھیں، اور اب مردود ہو گئی ہیں۔

اس تقریر پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جو لوگ مخالف رائے کو غلط اور مضر سمجھ کر اس کی مزاحمت کرتے ہیں، اس سے ان کا مطلب اس بات کا دعویٰ کرنا کہ وہ غلطی سے آزاد و بری ہیں نہیں ہوتا؛ بلکہ اس سے اس کا فرض ادا کرنا مقصود ہوتا ہے جو اُن پر باوصف قابل سہو و خطا ہونے کے، اپنے ایمان اور اپنے یقین کے مطابق عمل کرنے کا ہے۔

اگر لوگ اس وجہ سے اپنی رایوں کے موافق کاربند نہ ہوں کہ شاید وہ غلط ہوں، تو کوئی شخص اپنا کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔ لوگوں کا یہ فرض ہے کہ حتی المقدور وہ اپنی نہایت درست رائیں قایم کریں، اور بغور ان کو قرار دیں؛ اور جب اُن کی درستی کا

بخوبی یقین ہو جاوے، تو اس کے مخالف رایوں کے بند کرنے اور مزاحمت کرنے میں کوشش کریں۔ آدمیوں کو اپنی استعداد و قابلیت کو نہایت عمدہ طور سے برتنا چاہیئے یقین کامل کسی امر میں نہیں ہو سکتا۔ مگر ایسا یقین ہو سکتا ہے جو انسان کے مطالب کے لئے کافی ہو۔ انسان اپنی کارروائی کے لئے اپنی رائے کو درست و صحیح سمجھ سکتے ہیں، اور ان کو ایسا ہی سمجھنا چاہیئے! اور وہ اس سے زیادہ اور کوئی بات اس صورت میں اختیار نہیں کرتے کہ جبکہ وہ خراب آدمیوں کو ممانعت کرتے ہیں کہ ایسی رایوں کے شائع کرنے سے جو ان کے نزدیک فاسد اور مضر ہیں لوگوں کو خراب یا بد اخلاق یا بدمذہب نہ کریں۔

مگر مخالف رائے کو بند کرنے میں صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ انہوں نے اپنے تئیں قابلِ سہو و خطا سمجھ کر اپنے ایمان اور اپنے یقین کو موافق عمل کیا ہے، بلکہ اس سے بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔ اس بات میں کہ ایک رائے کو اس وجہ سے صحیح سمجھا جاوے کہ اس پر اعتراض اور حجت کرنے کا ہر طرح پر لوگوں کو موقع دیا گیا اور اس کی تردید نہ ہو سکی! اور اس بات میں کہ ایک رائے کو اس وجہ سے مان لیا گیا کہ اس کی تردید کی کسی کو اجازت نہیں ہوئی، زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ پس مخالف رایوں کی مزاحمت کرنے والے اپنی رائے کو اس وجہ سے صحیح نہیں سمجھتے کہ اس کی تردید نہیں ہو سکی، بلکہ اس لئے صحیح ٹھہراتے ہیں کہ اس کی تردید کی اجازت نہیں ہوئی! حالانکہ جس شرط سے ہم بطور جائز اپنی رائے کو عملدار ہونے کے لئے درست قرار دے سکتے ہیں! وہ صرف یہی ہے کہ لوگوں کو اس بات کی کامل آزادی ہو کہ وہ اس رائے کے برخلاف کہیں اور اس کو غلط ثابت کریں۔ اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ انسان، جس کے قوائے عقلی اور اور قویٰ کامل نہیں ہیں، اپنے آپ کو راہ راست پر ہونے کا یقین کر سکے۔

اہلِ مذاہب، جو صرف اپنے معتقد فیہ کی پیروی ہی کو راہِ راست سمجھتے ہیں، جب تک وہ بھی اس بات پر مباحثہ اور اظہار رائے کی اجازت نہ دیں کہ جس طرح پر اُنکا

عملدرآمد اور چال چلن یا اعتقاد اور خیال ہے، وہ صحیح طور سے ان کے معتقد فیہ کی پیروی ہے یا نہیں، اس وقت تک وہ بھی اپنے آپ کو راہ راست پر ہونے کا یقین نہیں کر سکتے۔

انسان کی پچھلی حالتوں کو موجودہ حالتوں سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانہ میں انسانوں کا یہی حال ہے کہ سنّو میں سے ایک ہی شخص اس قابل ہوتا ہے کہ کسی دقیق معاملہ پر رائے دے، اور ننانوے ۹۹ شخص اس میں رائے دینے کی لیاقت نہیں رکھتے، مگر اس ایک آدمی کی رائے کی عمدگی بھی صرف اضافی ہوتی ہے؛ اسلئے کہ اگلے زمانہ کے لوگوں میں اکثر آدمی جو سمجھ بوجھ اور لیاقت میں مشہور تھے ایسی رائیں رکھتے تھے کہ جن کی غلطی اب بخوبی روشن ہوگئی ہے۔ بہت سی ایسی باتیں ان کو پسندیدہ اور ان کے عملدرآمد تھیں جن کو اب کوئی بھی ٹھیک اور درست نہیں سمجھتا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں میں ہمیشہ معقول رایوں اور پسندہ رایوں کو غلبہ رہتا ہے مگر اس کا سبب بجز انسان کی عقل و فہم کی ایک عمدہ صفت کے جو نہایت ہی پسندیدہ ہے اور کوئی نہیں؛ اور وہ صفت یہ ہے کہ انسان کی غلطیاں اصلاح کی صلاحیت رکھتی ہیں، یعنی انسان اپنی غلطیوں کو مباحثہ اور تجربہ کے ذریعہ سے درست کر لینے کی قابلیت رکھتا ہے۔ پس انسان کی رائے کی تمام قوت اور قدر و منزلت کا حصر اس بات پر ہے کہ جب وہ غلط ہو تو صحیح کی جا سکتی ہے؛ مگر اس پر اعتماد اسی وقت کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کے صحیح کرنے کے ذریعے ہمیشہ برتاؤ میں رکھے جاویں۔

خیال کرنا چاہیئے کہ جس آدمی کی رائے حقیقت میں اعتماد کے قابل ہے، اس کی وہ رائے اس قدر و منزلت کو کسی وجہ سے پہونچی ہے؛ اس وجہ سے پہونچی ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنی طبیعت پر اس بات کو گوارا رکھا ہے کہ اس کی رائے پر نکتہ چینیاں کی جاویں؛ اور اس نے اپنا طریقہ یہ ٹھہرایا ہے کہ اپنے مخالف کی رائے کو ٹھنڈے دل سے سُنا، اور اس میں جو کچھ درست اور واجب تھا اس سے خود مستفید ہونا،

اور جو کچھ اس میں غلط اور ناروا جب تھا اس کو سمجھ لینا، اور موقع پر اس غلطی سے اوروں کو بھی آگاہ کر دینا۔ ایسا شخص گویا اس بات کو عملی طور پر تسلیم کرتا ہے کہ جس طریقہ سے انسان کسی معاملہ کے کُل مدارج کو جان سکتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ اس کی بابت ہر قسم کی رائے کے لوگوں کی گفتگو کو سُنے، اور جن جن طریقوں سے ہر سمجھ اور طریقے اور طبیعت کے آدمی اس معاملہ پر نظر کریں، ان سب طریقوں کو سوچے اور سمجھے۔ کسی دانا آدمی نے اپنی دانائی بجز اس طریقہ کے اور کسی طرح پر حاصل نہیں کی۔

انسان کی عقل و فہم کا خاصّہ یہی ہے کہ وہ اس طور کے سوا اور کسی طور سے مہذب اور معقول ہو ہی نہیں سکتی! اور صرف اس بات کی مستقل عادت کے سوا کہ اپنی رائے کو اوروں کی رایوں سے مقابلہ کر کے اس کی اصلاح اور تکمیل کیا کرے، اور کوئی بات اس پر اعتماد کرنے کی وجہ متصوّر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اس صورت میں اس شخص نے لوگوں کی ان تمام باتوں کو جو اس کے برخلاف کہہ سکتے تھے، بخوبی سُنا، اور تمام معترضوں کے سامنے اپنی رائے کو ڈالا! اور بعوض اس کے کہ مشکلاتوں اور اعتراضوں کو چھپا دے، خود اس نے جستجو کی اور ہر طرف سے جو کچھ روشنی پہونچی اسکو بند نہیں کیا۔ تو ایسا شخص البتہ اس بات کے خیال کرنے کا استحقاق رکھتا ہے کہ میری رائے ایسے شخص یا اشخاص سے جنہوں نے اپنی رائے کو اس طرح پر پختہ نہیں کیا، بہتر و فائق ہے۔

جس شخص کو اپنی رائے پر کسی قدر بھروسا کرنے کی خواہش ہو، یا یہ خواہش رکھتا ہو کہ عام لوگ بھی اس کو تسلیم کریں، اس کا طریقہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کو عام مباحثہ اور ہر قسم کے لوگوں کو اعتراضوں کے لئے حاضر کرے۔

اگر "نیوٹن" کی حکمت اور ہیئت اور مسئلہ ثقل پر اعتراض اور حجت کرنے کی اجازت نہ ہوتی، تو دنیا اس کی صحت اور صداقت پر ایسا پختہ یقین نہ کر سکتی، جیسا کہ اب کرتی ہے۔ کیا کچھ مخالفت ہے، جو لوگوں نے اس دانا حکیم کے ساتھ نہیں کی؟ اور کونسی مذہبی لعن و طعن ہے، جو اس سچے، اور سچی رائے رکھنے والے

حکیم کو نہیں دی گئی ؟ مگر غور کرنا چاہیئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا ؟ یہ ہوا کہ آج تمام دنیا، کیا دانا ، اور کیا نادان ، کیا حکیم اور کیا متعصب اہلِ مذہب ، سب اسی کو تسلیم کرتے ہیں، اور اسی کو سچ جانتے ہیں ، اور مذہبی عقائد سے بھی زیادہ اس کی سچائی دلوں میں بیٹھی ہے۔

بغیر آزادی رائے کے کسی چیز کی سچائی ، جہاں تک کہ اس کی سچائی دریافت ہونی ممکن ہے ، دریافت نہیں ہوسکتی۔ جن اعتقادوں کو ہم نہایت جائز و درست سمجھتے ہیں ، اُن کے جواز و درستی کی اور کوئی سند اور بنیاد بجز اس کے نہیں ہوسکتی کہ تمام دنیا کو اختیار دیا جاوے کہ وہ ان کو بے بنیاد ثابت کریں۔ اگر وہ لوگ ایسا قصد نہ کریں ، یا کریں اور کامیاب نہ ہوں ، تو بھی ہم ان پر یقین کامل رکھنے کے مجاز نہیں ہیں۔ البتہ ایسی اجازت دینے سے ہم نے ایک ایسا نہایت عمدہ ثبوت ان کی صحت کا حاصل کیا ہے ، جو انسانوں کی عقل کی حالت موجودہ سے ممکن تھا ؛ کیونکہ ایسی حالت میں ہم نے کسی ایسی بات سے غفلت نہیں کی جس سے صحیح صحیح بات ہم تک نہ پہونچ سکتی ہو ؛ اور اگر امر مذکورہ پر مباحثہ کی اجازت جاری رہے تو ہم امید کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی بات اس سے بہتر ، اور سچ اور صحیح ہے ، تو وہ اس وقت ہم کو حاصل ہو جائے گی ، جبکہ انسانوں کی عقل و فہم اس کے دریافت کرنے کے قابل ہوگی۔ اور اس اثنار میں ہم اس بات کو یقین کر سکتے ہیں کہ ہم راستی اور صداقت کے اس قدر قریب پہونچ گئے ہیں ، جس قدر کہ ہمارے زمانہ میں ممکن تھا۔ غرض کہ ایک خطا وار وجود ، جس کو کہ انسان کہتے ہیں ، اگر کسی امر کی نسبت کسی قدر یقین حاصل کرسکتا ہے ، تو اس کا یہی طریقہ ہے جو بیان ہوا۔

مگر ایک بات بہت بڑا دھوکا ہے ، جو انسانوں کو ، اور بعض دفعہ نیک گورنمنٹوں کو بھی ، آزادی رائے کے بند کرنے پر مائل کرتا ہے ؛ اور وہ سودمندی کا ہے ، جس کو غلط اور جھوٹا نام مصلحت عام کا دیا گیا ہے۔ اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ کسی رائے یا مسئلے یا عقیدے کی سچائی اور صحت پر بحث کرنے سے ، اس لئے ممانعت

کی جاتی ہے کہ گو وہ فی نفسہ کیسا ہی ہو مگر اس سے عام لوگوں کا پابند رہنا نہایت مفید اور باعثِ صلاح و فلاح عام لوگوں کا ہے۔ اور فی زمانا بذا ہندوستان میں، اور خصوصاً مسلمانوں میں، یہ رائے بکثرت رائج ہے، بلکہ اس گناہ کے کام کو ایک نیک کام تصور کیا جاتا ہے۔

اس رائے کا نتیجہ یہ ہے کہ مباحثے اور رایوں کی آزادی کا بند کرنا، اس مسئلے یا عقیدے کی صحت اور سچائی پر منحصر نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر مفید عام ہونے پر منحصر ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ایسی رائے رکھنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ وہی دعویٰ سابق، یعنی اپنے آپ کو ناقابل سہو و خطا سمجھنے کا، جس سے انھوں نے توبہ کی تھی، پھر پھرا کر پھر قائم ہو جاتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ پہلے وہ دعویٰ ایک بات پر تھا، اب وہی دعویٰ دوسری بات پر ہے: یعنی پہلے اس مسئلے یا عقیدے کے سچ ہونے پر تھا، اور اب اس کے مفید عام ہونے پر ہے؛ حالانکہ یہ بات بھی، کہ وہ مسئلہ یا عقیدہ مفید عام ہے، اسی قدر بحث و مباحثہ کا محتاج ہے جس قدر کہ وہ اصل مسئلہ یا عقیدہ محتاج ہے۔

ایسی رائے رکھنے والے اس غلطی پر ایک اور دوسری غلطی یہ کرتے ہیں: جبکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے صرف اس کی اصلیت اور سچائی پر بحث کی ممانعت کی ہے، اس کے مفید عام ہونے کی بحث پر ممانعت نہیں کی؛ اور یہ نہیں سمجھتے کہ رائے کی صداقت خود اس کے مفید ہونے کا ایک جزو ہے۔ ممکن نہیں کہ ہم کسی رائے کے مفید ہونے پر بغیر اس کی صحت اور سچائی ثابت کیے بحث کر سکیں۔ اگر ہم یہ بات جاننی چاہتے ہیں کہ آیا فلاں بات لوگوں کے حق میں مفید ہے یا نہیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس بات پر توجہ نہ کریں کہ آیا وہ بات سچ اور صحیح و درست بھی ہے یا نہیں؟ ادنیٰ و اعلیٰ، سب اس بات کو قبول کریں گے کہ کوئی رائے یا مسئلہ یا اعتقاد، جو صداقت اور راستی کے برخلاف ہے، دراصل کسی کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔

یہ تمام مباحثہ جو ہم نے کیا، ایسی صورت سے متعلق تھا کہ رائے مروّجہ اور تسلیم شدہ کو ہم نے غلط، اور اس کے برخلاف رائے کو جس کا بند رکھنا لوگ چاہتے تھے صحیح و درست، فرض کیا تھا. اب اس کے برخلاف شق کو اختیار کرتے ہیں! یعنی یہ فرض کرتے ہیں کہ رائے مروّجہ اور تسلیم شدہ صحیح ہے! اور اس کے برخلاف رائے جس کا بند کرنا چاہتے ہیں غلط اور نادرست ہے! اور اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اس غلط رائے کو بھی بند کرنا خالی برائی اور نقصان سے نہیں.

ہر ایک شخص کو، گو اس کی رائے کیسی ہی زبردست اور مضبوط ہو اور وہ کیسی ہی مشکل اور نارضامندی سے اپنی رائے کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرے، یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ اگر اس رائے پر بخوبی تمام اور نہایت بے باکی سے بے دھڑک مباحثہ نہیں ہو سکتا، تو وہ ایک مردہ اور مردار رائے قرار دی جاویگی، نہ ایک زندہ اور سچی حقیقت! اور وہ کبھی ایسی حق اور سچ بات قرار نہیں پا سکتی جس کا اثر ہمیشہ لوگوں کی طبیعتوں پر رہے.

گزشتہ اور حال کے زمانہ کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعضی دفعہ ظالم گورنمنٹوں نے بھی نہایت سچی اور صحیح بات کے رواج پر کوشش کی، اور ان کے ظلم نے اس پر آزادی سے مباحثہ کی اجازت نہیں دی. اور بہت سی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ نیک اور تربیت یافتہ گورنمنٹ نے نہایت سچی اور صحیح بات کا رواج دینا چاہا، اور لوگوں نے، یا تو اس خیال سے کہ ہمارے مباحثہ اور دلائل کو اس رائے میں کچھ مداخلت نہیں ہے، یا کوئی التفات نہیں کرتا، از خود مباحثہ کو نہیں اٹھایا! اپنے وہمی خوف سے، یا اراکین گورنمنٹ کی بدمزاجی کے ڈر سے، یا ان کے خلاف رائے کوئی بات نہ کہنی مصلحت وقت سمجھ کر، یا یہ خیال کر کر کہ گورنمنٹ کے یا کسی کے برخلاف بحث کرنا خیر خواہی نہیں ہے، مباحثہ کو ترک کر دیا. تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوا کہ اس تجویز نے کسی کے دلوں میں

مطلق اثر نہیں کیا، اور ایک مردہ رائے سے زیادہ اور کچھ مرتبہ لوگوں کے دلوں میں نہیں پایا۔

یہ بات؛ کہ سچی اور درست رائے بے مباحثہ و دلیل کے بھی طبیعتوں میں بیٹھ جاتی ہے اور گھر کر لیتی ہے، ایک خوش آیند مگر غلط آواز ہے۔ دنیا کو دیکھو کہ گروہ کے گروہ ایک دوسرے کی متناقض رائے پر جمے ہوئے ہیں، اور وہ متناقض رائیں ان کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ پھر کیا وہ دونوں متناقض رائیں سچی اور صحیح ہیں؟ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ بہت سی باتیں بے سمجھے اور بغیر دلیل کے، اور بغیر مباحثہ کے، لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتی ہیں؛ مگر ان کا صحیح و درست ہونا ضرور نہیں۔ سچ میں کوئی ایسی اعجازی کرامات نہیں ہے کہ وہ از خود دلوں میں بیٹھ جاوے۔ اس میں کچھ کرامات ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ مباحثہ کا اس کو خوف نہیں۔ سچ رائے بھی، اگر بلا دلیل و مباحثہ دل میں گھر کر لے، تو وہ سچی رائے نہیں کہلا دے گی، بلکہ تعصب اور جہل مرکب اس کا مناسب نام ہوگا گر ایسا طریقہ حق اور سچ بات کے قبول کرنے کا ایک ذی عقل مخلوق کے لئے، جیسا کہ انسان ہے، شایان نہیں؛ اور نہ یہ طریقہ راستی و حق کے پہچاننے کا ہے۔ بلکہ جو حق بات اس طرح پر قبول کی جاتی ہے، وہ ایک خیال فاسد اور باطل ہے، اور جن باتوں کو حق فرض کر لیا ہے ان کا اتفاقیہ قبول کر لینا ہے۔

نہایت سچ اور بالکل سچ تو یہ بات ہے کہ جس شخص نے جو رائے یا مذہب اختیار کر لیا ہے، وہی شخص اس کا جواب دہ ہے۔ اس رائے کے موجد یا اس مذہب کے پیشوا اور معلم اور مجتہد کچھ اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ مگر مسلمانوں نے اس آفتاب سے بھی زیادہ روشن مسئلہ سے آنکھ بند کر لی ہے۔ اب جو بڑے بڑے عالم فقیہہ اور دانا رہ گئے ہیں، ان کا یہ حال ہے کہ کسی چیز کی حقیقت سے، کیا مسائل علمی اور کیا عقاید مذہبی میں، کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ جس شخص سے کسی بات کی حقیقت پوچھو، اگر وہ بڑا ہی عالم ہے، تو بجز اس کے کہ فلاں شخص نے یہ لکھا ہے اور کچھ نہیں

بنا سکتا۔ تمام علوم کا مزہ اور تمام عقیدوں کا اثر دل سے جاتا رہا۔ پس آزادیٔ رائے کے قائم نہ رہنے کے یہ عمدہ اثر ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

آزادیٔ رائے غیر مفید ہونے کے ثبوت میں یہ بات اکثر پیش کی جاتی ہے کہ آزادیٔ رائے سے، جس کے ساتھ مباحثہ لازم و ملزوم ہے، کسی رائے کے حق یا سچ ہونے کا فیصلہ ممکن نہیں! بلکہ ہر ایک فریق کو اپنی اپنی رائے پر اور زیادہ پختگی اور اصرار ہو جاتا ہے۔ میں بھی اس بات کا اقرار کرتا ہوں اور اس بات کو تسلیم کرتا ہوں۔

درحقیقت تمام رایوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ خاص خاص فرقوں کی رائیں ہو جاتی ہیں۔ بحث و مباحثہ کی کمال آزادی سے بھی اس کا کچھ تدارک نہیں ہو سکتا، بلکہ اس سے اور زیادتی ہوتی جاتی ہے! اور حق کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ بعوض اس کے کہ لوگ اس کو سمجھیں اور بوجھیں، اسی وجہ سے اس کو نہیں سوچتے سمجھتے، بلکہ بے سوچے اور سمجھے نہایت زور شور سے رد کرتے ہیں، کہ وہ ایسے لوگوں کا قول ہے جن کو وہ اپنی مخالف جانتے ہیں یا ان سے نفرت رکھتے ہیں۔ مگر یہ بھی خوب جان لینا چاہیئے کہ آپس میں رایوں کے اختلاف اور مباحثہ سے انہی متعصب گروہوں کو جن کے باہم بحث ہوتی ہے چنداں فائدہ نہیں ہوتا! بلکہ اس کا عمدہ اور مفید اثر اُن لوگوں پر ہوتا ہے، جو اس کے دیکھنے سننے والے ہیں، اور جن کی طبیعتوں میں وہ جذبہ اور حرارت اور خود غرضی اور طرفداری نہیں ہوتی، جیسے کہ ان مخالف فرقوں کے حامیوں میں ہوتی ہے۔ اور جبکہ رفتہ رفتہ ان متعصبوں کی بھی حرارت کم ہو جاتی ہے، تو جو حق بات ہے وہ اس کے صحیح ہونے کا اقرار اپنے دل میں، یا اپنے خاص دوستوں میں، چپکے چپکے کرنے لگتے ہیں، گو کہ علانیہ کبھی اس کا اقرار نہ کریں۔

سچ بات پر سخت سے سخت نزاع کا ہونا کچھ بُرائی یا نقصان کی بات نہیں، بلکہ اسکا انسداد بہت بڑے نقصان کی بات ہے۔ جبکہ لوگ طرفین کے دلائل

سننے پر مجبور رہوتے ہیں تو ہمیشہ انصاف کی امید ہوتی ہے؛ مگر جبکہ وہ صرف یک طرفہ بات سنتے ہیں، تو اس صورت میں غلطیاں سختی پکڑ کر تعصب بن جاتی ہیں؛ اور سچ میں بھی سچ کا اثر اس لئے باقی نہیں رہتا کہ اس میں مبالغہ ہوتے ہوتے وہ خود ایک جھوٹ بن جاتا ہے۔

انصاف کی قوت جو انسان میں ہیں وہ اسی وقت بخوبی کام آتی ہے کہ ہر ایک معاملہ کے دونوں پہلوؤں کے حامی اور معاون تصفیہ کے وقت روبرو موجود ہوں، اور وہ دونوں ایسے زبردست ہوں کہ اپنے اپنے دلائل اور وجوہات کی سماعت پر لوگوں کو گویا مجبور کر دیں؛ اور سوائے اس کے اور کوئی صورت حق کے حاصل کرنے کی نہیں ہے۔

رائے کی آزادی پر ایک اور چیز جس کو لوگ سَنَد کہتے ہیں کبھی کبھی مزاحمت پہونچاتی ہے۔ اکثر ہوتا ہے کہ بحث کرنے والے اپنی اپنی تقریر کی تائید میں کسی مشہور شخص کے قول کی سند لاتے ہیں، حالانکہ کسی شخص کی سند پر اپنی رائے کو منحصر رکھنا خود آزادیٔ رائے کے برخلاف چلنا ہے۔

ہم کسی کے قول کو صحیح اور سچ سمجھتے ہیں تو اس کے قول کو پیش کرنا کچھ مفید نہیں ہے، بلکہ ہم کو وہ دلیلیں پیش کرنی چاہئیں جن سے اس قول کو ہم نے صحیح مانا ہے۔ اگر سُقراط و بُقراط نے کوئی ایسی بات کہی ہے جو درحقیقت صحیح نہیں ہے، تو وہ اُن کے کہنے سے صحیح نہیں ہو جانے کی؛ اور اگر کسی جاہل نے کوئی صحیح بات کہی ہے، تو وہ اس لئے کہ کسی جاہل نے کہی ہے غلط نہیں ہو جانے کی:

مرد باید کہ گیرد اندر گوش،
در نوشت است پند بر دیوار۔

اُمّید

موجودہ حالت گو وہ کیسی ہی اچھی یا بُری ہو، انسان کے دل کے مشغلہ کو کافی نہیں ہوتی۔ موجودہ رنج و خوشی، محبت و دوستی، کی چیزیں اتنی نہیں ہوتیں کہ انسان کے دل کی قوتوں کو ہمیشہ مشغول رکھیں؛ اس لئے اس بڑے کاریگر نے، جس نے انسان کے پتلے کو اپنے ہاتھ سے اور اپنی ہی مانند بنایا، اس میں چند اور قوتیں دی ہیں، جن کے سبب سے دل کے لئے کاموں کی کبھی کمی نہیں ہوتی، اور ہمیشہ و ہر وقت دل کے مشغول رہنے کا سامان مہیا اور موجود رہتا ہے۔ انہیں قوتوں کے ذریعہ سے گذری ہوئی باتیں پھر دل میں آتیں اور آئندہ کی باتوں کا اُن کے ہونے سے پیشتر خیال ہوتا ہے۔

وہ عجیب قوت جس کو ہم یاد کہتے ہیں ہمیشہ پیچھے دیکھتی رہتی ہے۔ جب کوئی موجودہ چیز ہم کو شغل کے لئے نہیں ملتی، تو وہ قوت پچھلی باتوں کو بُلا لاتی ہے، اور اسی کے فکر یا خیال سے ہمارے دل کو بہلائے رکھتی ہے۔ اس کی مثال جُگالی کرنے والے جانوروں کی ہے کہ پہلے تو گھانس دانہ سب کھا لیتے ہیں، اور جب ہو چکتا ہے، تو ایک کونے میں بیٹھ کر پھر اُسی پیٹ میں سے نکال کر چبائے جاتے ہیں۔

جس طرح کہ یاد پچھلی باتوں کو خالی وقت میں ہمارے دل میں مشغلہ کو بلا لاتی ہے، اُسی طرح ایک اور قوت ہے، جو آئندہ ہونے والی باتوں کے خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہے جس کا نام امید و بیم یا خوف و رجا ہے۔ انہی دونوں قسم کے خیالوں سے ہم آئندہ زمانہ تک پہونچ جاتے ہیں؛ اور جو باتیں کہ دور زمانہ میں شاید ہونے والی ہیں اور ظلمات کے پردوں میں چھپی ہوئی ہیں، اور بڑے گہرے اندھیرے گڑھوں میں

پڑی ہوئی ہیں، ان کو ایسا سمجھتے ہیں کہ ابھی ہو رہی ہیں؛ اُن کے ہونے سے پہلے اُنکی خوشی یا رنج اٹھانے لگتے ہیں؛ یہاں تک کہ اس زمانہ کا بھی، جب نہ یہ زمین ہوگی اور نہ یہ آسمان اور ہر چہار طرف سے لمن الملک الیوم کی آواز آتی ہوگی، ابھی خیال کر لیتے ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی زندگی، صرف موجودہ وقت پر محدود ہے؟

میرا ارادہ ہے کہ میں اس تحریر میں صرف اسی کا کچھ بیان کروں جس کو امید کہتے ہیں۔ ہماری خوشیاں اس قدر کم اور چند روزہ ہیں کہ اگر وہ قوت ہم میں نہ ہوتی، جس سے انسان ان عمدہ اور دل خوش کن چیزوں کا ان کے ہونے سے پہلے مزہ اٹھاتا ہے جن کا کبھی ہو جانا ممکن ہے، تو ہماری زندگی نہایت ہی خراب اور بدمزہ ہوتی۔ ایک شاعر کا قول ہے کہ:

"ہم کو تمام عمدہ چیزوں کے حاصل ہونے کی امید رکھنی چاہیئے؛ کیونکہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی امید نہ ہو سکے، اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ہم کو دے نہ سکے۔"

فارسی زبان کا مشہور قول ہے کہ "تمنا را عیبے نیست"۔ ایک ظریف نے کہا کہ:

"دنیا میں مجھے کسی چیز کا رنج نہیں ہے، کیونکہ امید مجھے ہمیشہ خوش رکھتی ہے۔"

دوستوں نے پوچھا کہ:

"کیا تم کو مرنے کا بھی رنج نہیں ہے؟"

اس نے کہا کہ:

"کیا عجب ہے کہ میں کبھی نہ مروں؛ کیونکہ خدا اس پر بھی قادر ہے کہ ایک ایسا شخص پیدا کرے جس کو موت نہ ہو، اور مجکو امید ہے کہ شاید وہ شخص میں ہی ہوں۔"

اُمید

یہ قول ایک ظرافت کا تھا، مگر سچ یہ ہے کہ زندگی کی اُمید ہی موت کا رنج ہم سے مٹاتی ہے۔ اگر ہم کو زندگی کی امید نہ ہوتی تو ہم سے زیادہ بدتر حالت کسی کی نہ ہوتی۔

زندگی ایک بے جان چیز کی مانند ہے جس میں کچھ حرکت نہیں ہوتی۔ امید اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ امید ہی کے سبب سے انسان میں سنجیدگی، اور بردباری اور خوش مزاجی کی عادت ہو جاتی ہے؛ گویا امید انسان کی روح کی جان ہے؛ ہمیشہ روح کو خوش رکھتی ہے اور تمام تکلیفوں کو آسان کر دیتی ہے؛ محنت پر رغبت دلاتی ہے؛ اور انسان کو نہایت سخت اور مشکل کاموں کے کرنے پر آمادہ رکھتی ہے۔

امید سے ایک اور بھی فائدہ ہے، جو کچھ کم نہیں ہے: کہ ہم موجودہ خوشیوں کی کچھ بہت قدر نہیں کرتے، اور اسی میں محو نہیں ہو جاتے۔ سیزر (قیصر روم) نے جب اپنا تمام مال و اسباب اپنے دوستوں کو بانٹ دیا، تو اس سے لوگوں نے پوچھا کہ:

"آپ نے اپنے لئے کیا رکھا؟"

اُس نے کہا کہ:

"امید!"

اس کی عالی طبیعت ان چیزوں کی کچھ قدر نہیں کرتی تھی، جو اس کے پاس تھیں، بلکہ ہمیشہ اس کا خیال کسی بہتر چیز کی طرف رہتا تھا۔

اگلے زمانہ کے لوگ بغیر امید کی زندگی کو نہایت ہی بُرا سمجھتے تھے۔ نقل ہے کہ خدا نے انسان کے پاس ایک صندوقچہ بھجوایا۔ جب اس کو کھولا تو اُس میں سے ہر ایک قسم کی بلائیں اور مصیبتیں اور بیماریاں جو انسان کو ہوتی ہیں، سب نکل پڑیں۔ امید بھی اسی صندوقچہ میں تھی، وہ نہ نکلی بلکہ ڈھکنے میں چمٹ رہی اور صندوقچہ ہی میں بند ہو گئی، تاکہ مصیبت کے وقت انسان کو تسلی دے۔

پس، جس زندگی میں امید ہے اس سے بڑھ کر کوئی خوش زندگی نہیں ہے!

خصوصاً، جبکہ امید ایک عمدہ چیز کی، اور اچھی بنا پر ہو! اور ایسی چیز کی ہو جو امید کرنے والے کو حقیقت میں خوش کر سکتی ہو۔ اس بات کی حقیقت وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خوش حال آدمی کے لئے بھی زمانہ موجودہ میں کافی خوشی نہیں ہے۔

میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مذہبی زندگی میں عمدہ عمدہ چیزوں کی بہت سی امیدیں ہوتی ہیں، اور ایسی چیزوں کی ہوتی ہیں جو ہم کو پورا پورا خوش کر سکتی ہیں۔ بلا شبہہ امید کے اثر سے انسان کی زندگی نہایت شیریں ہو جاتی ہے۔ اگر وہ موجودہ حالت سے خوش نہیں رہتا تو اس پر صبر تو ضرور آجاتا ہے۔ مگر مذہبی امیدیں اس سے بھی زیادہ فائدہ مند ہیں، کیونکہ ان میں عقل کے علاوہ مذہبی اعتقاد کی بھی نہایت قوت ہوتی ہے۔ مذہبی امید گویا مردہ کو زندہ کر دیتی ہے۔

میں ہمیشہ خدا کو اپنے سامنے رکھتا ہوں۔ وہ میری دائیں طرف ہے، اسی لئے میں گھبراتا نہیں۔ میرا دل خوش ہے۔ میرا گوشت بھی اسی امید میں رہیگا کہ تو میری روح کو جہنم میں نہ ڈالے! تو اپنی چیز کو خراب ہوتے ہوئے نہ دیکھے گا! تو ہی مجھ کو زندگی کے طریق دکھلائے گا! "تیری ہی حضور میں خوشی کا کمال ہے! تیری ہی دائیں طرف ہمیشہ کی خوشی ہے! آمین!!

اُمید کی خوشی

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک! اے آسمان کے تارو، تمہاری خوش نما چمک! اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو! اے پہاڑ کے عالی شان درختو! اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو! تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوش نما معلوم ہوتے ہو؟ اس لئے کہ ہم سے بہت دور ہو! اس دوری ہی نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے. اس وجہ ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے. تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے، وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے.

وہ چیز کیا ہے؟ کیا عقل ہے جس کو سب، سب سے اعلیٰ، سمجھتے ہیں؟ کیا وہ ہم کو آئندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے. بڑی دوڑ دھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی ہے، جو سب کے سامنے ہے.

او نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی بیٹی امید! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے! تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے! تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے! تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں، ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں! تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں! تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں! تیری ہی برکت سے خوشی، خوشی کے لئے نام آوری، نام آوری

کے لئے بہادری، بہادری کے لئے فیاضی، فیاضی کے لئے محبت، محبت کے لئے نیکی، تیار ہے! انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں!

وہ پہلا گنہگار انسان جب شیطان کے جنگل میں پھنسا، اور تمام نیکیوں نے اس کو چھوڑا، اور تمام بدیوں نے اس کو گھیرا، تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی! تو ہی نے اس نا امید کو نا امید ہونے نہیں دیا! تو ہی نے اس موت میں پھنسے ہوئے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس کو اس ذلت سے نکالا، اور پھر اسی کو اس اعلیٰ درجہ پر پہونچایا، جہاں کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا تھا۔

اس نیک نبی کو جس نے سیکڑوں برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مار پیٹ سہی، تیرا ہی خوبصورت چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا ناخدا، جبکہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا، اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا، تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔ زیتون کی ہری ٹہنی کو، جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہونچی، جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔

اے آسمانوں کی روشنی! اور اے نا امید دلوں کی تسلی امید! تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل پاتا ہے۔ تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے۔ تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔ عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ، بہتی نہروں کی لہریں، اس کے دل کو راحت دیتی ہیں۔ اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں، اور دور دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں۔

دیکھ! نادان بے بس بچہ گھوارہ میں سوتا ہے، اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے، اور اس گھوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچہ میں ہے، اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔

سورہ! میرے بچے سورہ!! اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک، سورہ! اے میرے دل کی کونپل سورہ! بڑھ! اور پھل پھول! تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پاوے! تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے! کوئی کٹھن گھڑی تجکو نہ آوے! کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے! سورہ! میرے بچے سورہ!! میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور، سورہ! تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا! تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی! تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا، آخرکار ہمارے دل کو تسلی دیں گی! تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اُجالا ہوگی! تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور کریں گی! تیری آواز ہمارے لئے خوش آئند راگنیاں ہوں گی! سورہ میرے بچے، سورہ! اے ہماری امیدوں کے پودے، سورہ! بولو! جب اس دنیا میں ہم تم سے جُدا ہو جاویں گے تو تم کیا کروگے؟ تم ہماری بے جان لاش کے پاس کھڑے ہوگے! تم پوچھوگے اور ہم کچھ نہ بولیں گے! تم روؤگے، اور ہم کچھ رحم نہ کریں گے! اے میرے پیارے رونے والے! تم ہمارے ڈھیر پر آکر ہماری روح کو خوش کروگے، آہ! ہم نہ ہوں گے، اور تم ہماری یادگاری میں آنسو بہاؤگے! اپنی ماں کا محبت بھرا چہرہ، اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کروگے! آہ! ہم کو یہی رنج ہے کہ اس وقت ہماری محبت یاد کر کر تم رنجیدہ ہوگے! سورہ! میرے بچے، سورہ! سورہ میرے بالے، سورہ!!"

یہ امیدوں کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جبکہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کرسکتا

تھا؛ مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا، اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور "اماں! اماں!ا" کہنا سیکھا، اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہونچنے لگی؛ آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتشِ محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا؛ پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا۔ رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا؛ اور جبکہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر، ہاتھ منہ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا، اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا، تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہوگئیں! اس کے ماں باپ اس معصوم سینہ سے سچی ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں! او ہماری پیاری امید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

دیکھو! وہ بڈھا، آنکھوں سے اندھا، اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔ اس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں سے غائب ہوگیا ہے۔ وہ اس کو ڈھونڈتا ہے پر وہ نہیں ملتا؛ مایوس ہے، پر امید نہیں ٹوٹی؛ لہو بھرا، دانتوں پھٹا کُرتا دیکھتا ہے، پر ملنے سے نا امید نہیں؛ فاقوں سے خشک ہے؛ غم سے زار زار ہے روتے روتے آنکھیں سفید ہوگئی ہیں، کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے؛ مگر صرف ایک اُمید ہے، جس نے اس کو وصل کی امید میں زندہ، اور اس کے خیال میں خوش رکھا ہے۔

دیکھ! وہ بے گناہ قیدی، اندھیرے کنوئیں میں، سات تہ خانوں میں بند ہے۔ اس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے۔ بے یار و دیار غیر قوم، غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے۔ بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہونچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جُدائی اس کے دل کو غمگین رکھتی ہے۔ قید خانہ کی مصیبت، اس کی تنہائی اس گھر کا اندھیرا، اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال، اس کو نہایت ہی رنجیدہ رکھتا ہے۔ اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے۔ مگر

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! تجھی میں اس کی خوشی ہے۔

وہ بہادر سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پہ کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں؛ مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں، جبکہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چُپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں، اور لڑائی کا میدان ایک سُن سان کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں عجب قسم کی خوف ملی ہوئی جُرأت ہوتی ہے؛ اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہے، اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہونچتی ہے، اور وہ آنکھ اُٹھا کر نہایت بہادری سے، بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے؛ اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں، اور بادل کی سی کڑک کنے والی، اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے؛ اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا، زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے، تو اے بہادروں کی قوتِ بازو، اور اے بہادری کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتحمندی کا خیال اس کے دِل کو تقویت دیتا ہے۔ اس کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ ان کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے۔ مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے، اُنہیں کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتلاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کُفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند، عزیز، اقارب سمجھاتے ہیں؛ اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں ؎

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں بھائی سیّد تو کچھ دوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں، مگر ہاں ہاں کر کر، محنت اور دل سوزی سے دور رہ کر؛

بہت سی ہمدردی کرتے ہیں، پر کوٹھی کٹھلے سے الگ کر کر۔ دل ہر وقت بیقرار ہے۔ کسی کو اپنا سا نہیں پاتا۔ کسی پہ دل نہیں ٹھہرتا۔ مگر اے بے قرار دلوں کی راحت، اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت! تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے!! تو ہی ہمارے دل کی تسلی ہے۔ تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے۔ تیری ہی تقویت سے ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہونچیں گے۔ تیرے ہی سبب گوہرِ مراد کو پاویں گے۔ اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے "مہدی" کی پیاری امید! تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! جبکہ زندگانی کا چراغ ٹمٹماتا ہے؛ اور دنیاوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے؛ ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی؛ رنگ فق ہو جاتا ہے! منہ پر مُردنی چھا جاتی ہے؛ ہُوا، ہوائیں؛ پانی، پانی میں؛ مٹی، مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے؛ تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔ اس وقت اس زرد چہرے، اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں، اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں، اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تیری صدا کان میں آتی ہے، اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے، اور ایک نئی لازوال زندگی کی، جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لئے موسم بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ اس کی لازوال آنے والی خوشی کی امید، تمام دنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے! اور غم کی شام کو، خوشی کی صبح سے بدل دیتی ہے! گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوفناک چیز ہے۔

ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا میں، جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہونچتی، تیری راہ مین چیزوں سے طے ہوتی ہے: ایمان کے توشے، اور امید کے ہادی، اور موت کی سواری

ہے۔ مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے، وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے جس کا پیارا نام امید ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی؛ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے، اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے اس بے تکلیف آنے والے زمانہ کی امید میں نہایت بردباری سے، اور رنجوں کے زمانہ کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے۔

بقدر ہر سکوں راحت بود، بنگر تفاوت را!
دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مُردن۔

خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ، ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے ۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے ، تو اسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے اسی طرح ۔ جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے ، تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے ، جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے ۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ ، اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے ، اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا پگلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے ۔

اول اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں ، اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں ، اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کے اپنے دل کو خوش کرتے ہیں ۔ پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے ، پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے ، اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے ؛ اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے ، وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں ؛ اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے ، جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں ، اور ان کی اس قدر قدر کرتے ہیں ۔ جبکہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے ، اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آجاتا ہے ، تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی

ہو جاتی ہے، اور وہ مکر و فریب ہماری بیمار طبیعت پر غالب آ جاتا ہے۔

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے، تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ جب ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے! یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں، تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں، جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہیں، مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بد زیب ہیں، جیسے کہ دوسروں کے کپڑے، جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔

اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں، یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم اپنی حقیقت کو درست کریں، اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں، اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جاویں! کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں، اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور چست و چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے، جیسے کہ ایک روتی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی، جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے، جب چپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے، تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے! اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے، اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیئے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے، اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے۔

لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی وہ تعریف کرتے ہیں! اور شاعری کی خوبی سے ان شاعروں کا نام

بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کے سبب سے، اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے۔ مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خط و خال کو بھی قائم رکھتا ہے، اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوشنما معلوم ہو۔ ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں، جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی، بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے: جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے، تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے، جیسے عمدہ خوشبو کا! مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے، تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔

فیاض آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے! اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور توصیف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت و حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں، انہی لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے، جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے، جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔

ریا

دنیا میں ایسے لوگ بھی بہت ہیں، جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ دنیادار اور رند مشرب آدمی، جس قدر کہ دراصل وہ بد ہیں، اس سے زیادہ اپنے تئیں بد بتاتے ہیں۔ دین داری کی بناوٹ کرنے والے، جس قدر کہ ہوتے ہیں، اس سے زیادہ نیک اپنے آپ کو جتلاتے ہیں۔ وہ تو دین داری کی ذرا ذرا سی باتوں سے بھی بھاگتے ہیں؛ اور دن رات عشق، تماش بینی اور رِیچ پینے کی باتوں کی، جن کو دراصل انہوں نے کیا بھی نہیں، گپیں اڑاتے ہیں؛ اور یہ حضرت بے شمار گناہوں اور بدیوں کو ایک ظاہر دین داری کے پردے میں چھپاتے ہیں اور ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں قسم کے آدمی چنداں بُرے نہیں ہیں؛ مگر ایک اور تیسری قسم کے لوگ ہیں جو ان دونوں قسموں سے علیحدہ ہیں، اور انہیں کا کچھ ذکر میں اس تحریر میں کرنا چاہتا ہوں۔ اُن کی بناوٹ ایک اور ہی عجب قسم کی ہے۔ وہ اپنی بناوٹ سے دنیا کے لوگوں ہی کو فریب نہیں دیتے، بلکہ اکثر خود آپ بھی دھوکے میں پڑتے ہیں۔ وہ بناوٹ خود ان سے انہیں کے دل کے حال کو چھپاتی ہے۔ جسقدر کہ درحقیقت وہ نیک ہیں، اس سے زیادہ ان کو نیک جتاتی ہے۔ پھر تو وہ لوگ یا اپنی بدیوں پر خیال ہی نہیں کرتے یا ان بدیوں کو نیکیاں سمجھتے ہیں۔ مقدس داؤدؑ نے نہایت دلچسپ لفظوں میں اس بُرائی سے پناہ مانگی ہے، اور اس طرح پر خدا کی مناجات کی ہے:

"کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے! تو ہی مجھ کو میرے پوشیدہ عیبوں سے

پاک کر!"

جو لوگ علانیہ بدی کرتے ہیں، اگر ان کو بدیوں اور گناہوں سے بچانے کے لئے نصیحت کی ضرورت ہے تو وہ لوگ، جو درحقیقت موت کی راہ چلتے ہیں، اور اپنے تئیں نیکی اور زندگی کے رستہ پر سمجھتے ہیں، کسی قدر رحم کے لائق ہیں، اور کتنی نصیحت کے محتاج ہیں! ہاں میں چند قاعدے بیان کرنا چاہتا ہوں، جن سے وہ بلائیں جو دل کے کونوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں، اور جن کے چھپے رہنے سے انسان خود اپنے دل کا سچا حال آپ نہیں جان سکتا، معلوم ہو سکیں۔

عام قاعدہ تو اس کے لئے یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو اُن مذہبی اصولوں سے، جو ہماری ہدایت کے لئے مقدس کتاب اللہ میں لکھے ہیں، جانچیں! اور اپنی زندگی کو اس پاک شخص کی زندگی سے مقابلہ کریں، جس کی زندگی ہماری زندگی کے لئے نمونہ ہے؛ اور جو اپنی پیروی کرنے والوں کے لئے، بلکہ تمام دنیا کے لئے بڑا ہادی اور بہت بڑا اُستاد ہے۔ ان دونوں قاعدوں کے برتنے میں بڑی بڑی غلطیاں پڑتی ہیں۔ کچھ تو لوگوں کی سمجھ میں غلطیاں ہوتی ہیں، اور کچھ آپس میں اختلاف رائے ہوتا ہے، جو بن ہوئے رہ نہیں سکتا! اور کچھ زمانہ کے گزرنے سے ٹھیک ٹھیک حالت اور کیفیت اُن واقعات کی جو گزرے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے برخلاف اگلے مسلمان مصنفوں کے صرف انہی قاعدوں کے بیان کرنے پر میں اکتفا نہیں کرتا؛ بلکہ اور بھی قاعدے بیان کرتا ہوں، جو انسان کو ٹھیک ٹھیک مطلوبہ راہ پر لاتے ہیں۔

اپنے پوشیدہ عیبوں کے معلوم کرنے کا ایک عمدہ قاعدہ یہ ہے، کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دشمن ہم کو کیا کہتے ہیں۔ ہمارے دوست اکثر ہمارے دل کے موافق ہماری تعریف کرتے ہیں۔ یا تو ہمارے عیب ان کو عیب ہی نہیں معلوم ہوتے، اور یا ہماری خاطر کو ایسا عزیز رکھتے ہیں کہ اس کو رنجیدہ نہ کرنے کے خیال سے ان کو چھپاتے ہیں، یا ایسی نرمی سے کہتے ہیں کہ ہم ان کو نہایت ہی خفیف سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے، دشمن ہم کو خوب ٹٹولتا ہے اور کونے کونے سے ڈھونڈھ کے

ہمارے عیب نکالتا ہے۔ گو وہ دشمنی سے چھوٹی بات کو بہت بڑا کر دیتا ہے، مگر اکثر اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہوتی ہے:

تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا!

دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے، اور دشمن عیبوں کو۔ اس لیے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب ان عیبوں کو چھوڑ دیا، تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا، جو ایک شفیق استاد سے ملنا چاہیے تھا۔

دشمن جو عیب غلط یا صحیح ہم میں لگاتا ہے، ہمارے فائدے سے خالی نہیں۔ اگر وہ ہم میں ہوتا ہے، تو ہم اپنے عیب سے مطلع ہوتے ہیں؛ اور اگر نہیں ہوتا، تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ عیب ہم میں نہیں۔ سچ ہے کہ "دشمن از دوست ناصح تراست؛ ایں چنیں نیکوئی نہ گوید، و آں ہر بدی نکو باید۔"

"پلوٹارک" کا دشمنی کے فائدوں پہ جو مضمون ہے، اس میں اس نے یہ بات لکھی ہے کہ:

"دشمن جو ہم کو بدنام کرتے ہیں، اس سے ہم کو ہماری برائیاں معلوم ہوتی ہیں؛ اور ہماری گفتگو میں، اور ہمارے چال چلن میں، اور ہماری تحریر میں جو نقص ہیں، وہ بغیر ایسے دشمن کی مدد کے کبھی معلوم نہیں ہوتے۔"

علیٰ ہذا القیاس، اگر ہم خود اپنے آپ کو سمجھنا چاہیں کہ ہم کیا ہیں، تو ہم کو اس بات پر غور کرنی چاہیے کہ جو لوگ ہماری تعریف کرتے ہیں، تو ان میں سے ہم کس قدر کے مستحق ہیں؛ اور پھر یہ سوچنا چاہیے کہ جن کاموں کے سبب سے وہ تعریف کرتے ہیں، وہ کام ہم عمدہ غرض سے اور نیک نیتی سے دنیا کو فائدہ پہونچانے کے لیے کرتے ہیں یا نہیں؛ اور پھر ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ نیکیاں، جن کے سبب ہماری تعریف کرنے والے ہماری تعریف کرتے ہیں، در اصل ہم میں کہاں تک ہیں۔

ان باتوں پر انسان کو بخوبی غور کرنا نہایت ضرور ہے؛ کیونکہ ہمارا یہ حال

ہے کہ کبھی تو ہم لوگوں کی رایوں کو جو ہماری نسبت ہیں پسند کر کر اپنے تئیں بہت بُرا سمجھنے لگتے ہیں، اور کبھی ان کو ناپسند کرتے ہیں؛ اور جو کچھ ہمارا دل کہتا ہے، اس کے مقابلہ میں ان تمام رایوں کو نہیں مانتے۔

ہم کو ایسی نیکی پر بھی، جس کو ہم نے اپنے خیال میں نیک سمجھا ہے، مگر درحقیقت اس کی نیکی مشتبہ ہے، زیادہ اصرار کرنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ ان لوگوں کی رایوں کو بھی نہایت قدر و منزلت کرنی چاہیئے جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں اور جو عقلمند اور نیک دل ہیں؛ اور جس طرح ہم نیک دلی سے بات کہتے ہیں، اسی طرح وہ بھی نیک دلی سے ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ان اختلاف کرنے والوں نے صرف آزادیٔ رائے اور اس نیک دلی سے جس کے سرچشمہ کی سوت قدرت نے ہر ایک انسان کے دل میں کھولی ہے، اختلاف کیا ہے۔ یا کسی بیرونی دباؤ، یا پابندیٔ رسم و رواج، اور تعصب اور تقلید نے اُن کے دل کو پھیرا ہے؛ کیونکہ اگر یہ پچھلی بات اختلاف رائے کا سبب ہو، تو وہ نہایت بے قدر ہو جاتی ہے۔

جہاں ہم کو دھوکا کھانے کا احتمال ہے، وہاں ہم کو نہایت ہوشیاری اور بہت خبرداری سے کام کرنا چاہیئے۔ حد سے زیادہ سرگرمی، اور تعصب، اور کسی خاص فرقہ کو یا کسی خاص رائے کے لوگوں کو بُرا اور حقیر سمجھنا، یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ہزاروں آفتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ فی نفسہ نہایت ہی بُری ہیں۔ گو وہ ہم سے کمزور دل آدمیوں کو اچھی معلوم ہوتی ہوں؛ مگر اس پر بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جو دینداری اور نیکی کے لئے نہایت مشہور ہیں، مگر نہایت لغو اور نرے شیطانی اصولوں کو نیکی سمجھ کر اپنے دلوں میں اس کی جڑ گاڑ دی ہے۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے آج تک کوئی ایسا عقلمند اور انصاف پسند شخص نہیں دیکھا، جس میں پوری پوری یہ سب باتیں ہوں اور پھر بھی وہ گناہ سے پاک ہو۔

اس طرح ہم کو ان کاموں سے بھی ڈرنا چاہیئے، جو انسان کے کم زور دل کی قدرتی بناوٹ سے، یا کسی خاص شوق سے، یا کسی خاص تعلیم کے اثر سے، یا کسی اور سبب سے ہوتے ہیں جس میں ہمارا دُنیوی فائدہ ہے۔ ایسی حالت میں انسان کی سمجھ نہایت آسانی سے حق بات کی طرف سے پھر جاتی ہے، اور اس کا دل غلطی کی طرف مائل ہو جاتا ہے! اور یہی باتیں ہیں جن کے سبب سے تعصّب، اور ہزاروں غلطیاں، اور پوشیدہ برائیاں، اور لامعلوم عیب، انسان کے دل میں گھُس جاتے ہیں۔ جس کام کے کرنے میں عقل کے سوا اور جذبوں کی بھی ترغیب ہو، اس کے کرنے میں عقلمند آدمی کو ہمیشہ ڈرنا، اور ہمیشہ اس پر شبہہ کرنا چاہیئے، کہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی بُرائی چھپی ہوئی ہوگی۔

ان اصولوں پر اپنے خیالوں کو جانچنا، اور اپنے دل کو ٹٹولنا، اور دل کے تاریک جذبوں کو ڈھونڈنا، ہمارے لئے اُس سے بڑھ کر کوئی چیز مفید نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے دل میں ایسی مضبوط نیکی بٹھانی چاہیں جو قیامت کے دن ہمارے کام آوے، جس دن کہ ہمارے دل کے بھیدوں کا جاننے والا ہمارے دل کو جانچیگا، جسکی عقل اور انصاف کی کچھ انتہا نہیں، تو ان اصولوں پر چلنے سے بہتر ہمارے لئے کوئی راہ نہیں۔

ہمارے بانئ اسلامؐ نے، جب ہمکو یہ سکھلایا ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے! ہمارے دل کے چھپے بھیدوں کو جانتا ہے؛ تو اس نے کس خوبی اور خوبصورتی سے اس ریاکاری کی برائی ہم کو بتلا دی جس سے انسان دنیا کو دھوکا دیتا ہے، اور خود اپنے آپ کو بھی فریب میں ڈالتا ہے۔

داؤدؑ نے بھی اپنی مناجات میں اس ریاکاری کے خوف کو، جس سے انسان خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، نہایت دلچسپ لفظوں میں ادا کیا ہے، جہاں اس نے کہا ہے کہ "اے خدا! مجھ کو جانچ! میرے دل کی تہ کو ڈھونڈ! میرے خیالوں کو دیکھ! مجھ کو ٹٹول! مجھ کو بخوبی پرکھ! کہ مجھ میں کس بُرائی نے راہ کی ہے، اور مجھ کو ایسی راہ پر لے چل جو ہمیشہ کو قائم رہے۔"

تعصّب

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بدخصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔

متعصب، گو اپنی زبان سے نہ کہے، مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت، جو عمدہ ترین خصائل انسانی سے ہے، اس میں نہیں ہے۔ متعصب، اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے، تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا؛ کیونکہ اس کا تعصب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے، اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا؛ اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے، بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے، تو اس کے فائدے اور اس کی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا، کیونکہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

تعصب انسان کو ہر طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت اور مفید سمجھتا ہے، مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا، اور دیدہ و دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔

مذہبی تعصبات کی نسبت بھی ہم کچھ تھوڑا سا بیان کریں گے؛ مگر اوّل امور تمدن و معاشرت میں جو نقصان تعصب سے پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔

انسان قواعد قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ وہ تنہا اپنی حوائج ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی، جو دوستی اور

تعصّب

محبت سے ہاتھ آتے ہیں، ضرورت ہوتی ہے۔ مگر متعصب بسبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے، اور کسی کی دوستی اور محبت کی طرف بجز ان چند لوگوں کے جو اس کے ہم رائے ہیں مائل نہیں ہوتا۔

عقل اور قواعد قدرت کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ امور متعلق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ منفعت، اور زیادہ آرام، اور زیادہ لیاقت، اور زیادہ عزت کی ہیں، ان کو انسان اختیار کرے؛ مگر متعصب ان سب نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔

ہنر، اور فن، اور علم، ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیے؛ مگر متعصب اپنی بدخصلت سے ہر ایک ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجہ تک پہونچنے سے محروم رہتا ہے۔

وہ ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی نئی تحقیقات سے، اور نئے علوم اور فنون سے حاصل ہوتی ہیں، محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بےکار ہو جاتی ہے، اور جو کچھ اس میں سمائی ہوئی ہے، اس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اس میں طاقت اور قوت نہیں رہتی۔ وہ ایک ایسے جانور کی مانند ہو جاتا ہے کہ اس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے اس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل نہیں ہوتا۔

بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں، کیا اخلاق میں، اور کیا علم و ہنر میں؛ اور کیا فضل و دانش میں؛ اور کیا تہذیب و شائستگی میں، اور کیا جاہ و حشمت، مال، و دولت میں؛ اعلیٰ درجہ سے نہایت پست درجۂ ذلت و خواری کو پہونچ گئی ہیں۔ اور بہت سی قومیں ہیں جنھوں نے اپنی بےتعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں، اور ادنیٰ درجہ سے ترقی کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر پہونچ گئیں۔

مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصب کی بدخصلت میں گرفتار ہیں، اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے

اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم کر دکھانے سے محروم۔ اور ذلت اور خواری سے بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں! اور اسی لیے میری خواہش ہے کہ وہ اس بدخصلت سے نکلیں اور علم و فضل اور ہنر و کمال کے اعلیٰ درجہ کی عزت تک پہونچیں۔

ہم مسلمانوں میں ایک غلطی پڑی ہے کہ بعض دفعہ ایک غلط نانیکی کے جذبہ سے تعصب کو اچھا سمجھتے ہیں! اور جو شخص اپنے مذہب میں بڑا متعصب ہو، اور تمام شخصوں کو جو اس مذہب کے نہیں ہیں۔ اور تمام ان علوم اور فنون کو جو اس مذہب کے لوگوں میں نہیں ہیں، نہایت حقارت سے دیکھے اور برا سمجھے، اس شخص کو نہایت قابل تعریف اور توصیف کے، اور بڑا پختہ اور سچا اپنے مذہب میں سمجھتے ہیں، مگر ایسا سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہے، جس نے حقیقت میں مسلمانوں کو برباد کر دیا ہے۔

ہمارا مذہب اور مذہبی علوم، اور دنیا اور دنیاوی علوم، بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ پس بڑی نادانی ہے جو دنیاوی علوم اور فنون کے سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لاویں۔

اگر یہ خیال ہو کہ ان دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقاید مذہبی میں سستی آتی ہے، کیونکہ مذہبی مسائل ان دنیاوی علوم کے پڑھنے سے مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں، تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم سچے مذہب کو ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں، کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اس کی برہمی کا خیال کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہا! اسلام تو ایسا مستحکم اور سچا مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جاوے گی، اسی قدر اس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی۔

اب ہم یہ بات بتاتے ہیں کہ اپنے مذہب میں پختہ ہونا جدا بات ہے، اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے جو کسی اہل مذہب کے لئے ہو سکتی ہے! اور تعصب، گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہ ہو، نہایت برا اور خود مذہب کو نقصان پہنچانے والا ہے۔

غیر متعصب گو اپنے مذہب میں پختہ، ہمیشہ سچا دوست اپنے مذہب

کا ہوتا ہے۔ اس کی خوبیوں اور نیکیوں کو پھیلاتا ہے ؛ اس کے اصول کو دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے ؛ مخالفوں اور معترضوں اور بُرا کہنے والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سنتا ہے ؛ اور خود بھی اس کے دفعیہ پر مستعد ہوتا ہے ؛ اور اَور لوگوں کو بھی اس کے دفعیہ کا موقع دیتا ہے۔

برخلاف اس کے، متعصب نادان دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ وہ سراسر اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہونچاتا ہے۔ پہلی بسم اللہ اپنی بدخصلت اختیار کرنے سے جو ہر عقلمند کے نزدیک نفرت کے قابل ہے ؛ اپنے مذہب کے حُسنِ اخلاق اور اس کے نتیجوں کی خوبی پر داغ لگاتا ہے ؛ اپنے مذہب کی خوبیوں کے پھیلنے اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنے کے بدلے، اُلٹا، اسکا ہارج ذی ہوتا ہے ؛ اپنے تعصب کے سبب بداخلاق، اور مغرور، اور متقشف، سخت دل ہو جاتا ہے۔

مذہب میں، متعصب شخص دوسروں کے اعتراضوں کو جو اس کے مذہب پر ہیں سننا اور مشہور ہونا، پسند نہیں کرتا ؛ اور اس سبب سے ضمناً وہ اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیقات کئے اور بلا جواب دئے باقی رہ جاویں۔ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر، گویا، یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مذہب کو مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت اندیشہ اور اس کے برہم ہو جانے کا خوف ہے۔ پس یہ باتیں مذہب کی دوستی کی نہیں ہیں، بلکہ مخالفوں کی فتح یابی اور میدان جیت لینے کی ہیں۔ غرض کہ تعصّب، خواہ دینی باتوں میں ہو، یا دنیاوی باتوں میں، نہایت بُرا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

مغرور و متکبر ہو جانا، اور اپنے ہم جنسوں کو سوائے چند کے نہایت حقیر و ذلیل سمجھنا، متعصّب کا خاصہ ہوتا ہے۔ اس کے اصول کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں سے سوائے چند کے کنارہ گزیں ہو ؛ مگر ایسا کر نہیں سکتا، اور بمجبوری ہر ایک سے ملتا ہے ؛ اور اوپری دل سے ان کا ادب اور اپنی جھوٹی

نیازمندی بھی ظاہر کرتا ہے! اور ایسا کرنے سے ایک اور بد خصلت، نفاق اور کذب اور دغابازی اور فریب و مکاری کی، اپنے میں پیدا کرتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات، اور تمام خوبیاں، اور خوشیاں حاصل کی ہوں! بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بے نصیب رہتا ہے۔ علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی۔ ہنر و فن میں اس کو دستگاہ نہیں ہوتی۔ دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے۔ عجائباتِ قدرت کے دیکھنے سے محروم ہوتا ہے۔ حصولِ معاش، اور دنیاوی عزت اور تموّل، مثل تجارت وغیرہ کے، دیکھے جاتے رہتے ہیں! اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل اور خوار، اور حقیر و ناچیز، ہوتا جاتا ہے۔

اس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے، جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اور ہمجنس کیا کر رہے ہیں؟ بلبل کیا چہچہاتی ہے؟ اور قمری کیا غل مچاتی ہے؟ بیا کیا بُن رہا ہے؟ اور مکھی کیا چُن رہی ہے؟ وہ بجز کوڑے پر کی گھاس چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے؟ اور پھول کیوں کھلا ہے؟ نرگس کیا دیکھتی ہے؟ اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے؟

تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ دل سے نہیں جاتا، کوئی ہنر و کمال اس میں نہیں آتا۔ تربیت و شائستگی، تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا! اور جبکہ وہ مذہبی غلط نمائیگی کے پردے میں ظہور کرتا ہے، تو اور بھی ستم قائل ہوتا ہے! کیونکہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ انسان کے خراب و برباد کرنے کے لئے شیطان کا سب سے بڑا داؤں تعصب کو مذہبی رنگت سے دل میں ڈالنا، اور اس تاریکی کے فرشتہ کو روشنی کا فرشتہ کر کر دکھلانا ہے۔

پس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بہت بڑا منصف ہے، اور سچا سچائی کا پسند کرنے والا ہے۔ وہ ہمارے دلوں کے

بعید جانتا ہے۔ وہ ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے۔ پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بہت بُری خصلت ہے چھوڑنا چاہیے۔

تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں۔ ہم کو سب سے محبت، اور سچا معاملہ رکھنا، اور سب سے سچی دوستی، اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا، ہمارا قدرتی فرض ہے۔ پس اسی کی ہم کو پیروی کرنی چاہیئے۔
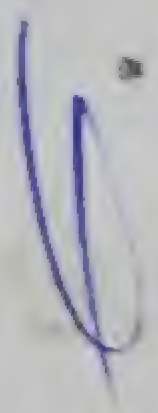
بحث و تکرار

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں، تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے، اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں، اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چِر کر کانوں سے جا لگتی ہیں، اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، مُنہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور "غیمنت! غیمنت!!" آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اِس کا ہاتھ اُس کے گلے میں! اور اُس کی ٹانگ اِس کی کمر میں! اُس کا کان اِس کے مُنہ میں! اور اِس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں! اِس نے اُس کو کاٹا، اور اُس نے اِس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا! جو کمزور ہوا، دُم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اس طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے: ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے، "واہ! یوں نہیں، یوں ہے۔" وہ کہتا ہے، "واہ! تم کیا جانو!" وہ بولتا ہے، "تم کیا جانو!!" دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رُخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، باچھیں چِر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس

جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ، عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ "عینف! عینف!!" آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھایا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اُس کے ہاتھ میں، اور اُس کی ڈاڑھی اس کی مٹھی میں، کتیا دُکی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کرکے چھڑا دیا، تو غراتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا اور ایک اُدھر! اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا، تو کمزور نے پٹ کر، کپڑے جھاڑتے، سر سہلاتے، اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے، اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرغرش ہوکر رہ جاتی ہے، کہیں تُو تُو تکار تک نوبت آجاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے، اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذرتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے، اور اس کے پرکھنے کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو، تو یہ مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی محبت اور دوستی کو، ہاتھ سے دینا نہ چاہیئے۔

پس، اے میرے عزیز ہموطنو! جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو، یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو، تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دوبدو بات چیت کرتے ہو، تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ، آواز، وضع، لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو، مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو؛ مثلاً یہ کہ "میری سمجھ میں نہیں آیا" یا "شاید مجھے دھوکا ہوا" یا "میں غلط سمجھا"، "گو بات تو عجیب ہے، مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں"؛ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو، اور

کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے، تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ "میں اس کو پھر سوچوں گا"، یا "اس پر پھر خیال کروں گا"، جھگڑے کو، کچھ ہنسی خو[...]
دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کردو۔

دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اس دو تین دفعہ کی اُر[...]
پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے، اور نہ تمہارا مطلب باتوں [...]
اس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ خفیف دینے کا تھا۔ کیونکہ جھگڑا یا شبہ [...]
دنوں تک رہنے سے، دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے! اور رفتہ رفتہ دو[...]
ٹوٹ جاتی ہے! اور ایسی عزیز چیز، جیسی کہ دوستی، ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جب تم مجلس میں ہو، جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں، جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو آنے مت دو! کیونکہ جب تقریر بڑ[...]
جاتی ہے، تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے
اور تیزی اور کدورت تقریر ہونے لگی ہے، تو جسقدر جلد ممکن ہو، اس کو ختم کردو اور
آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کرلو۔

میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ اُن کی مجلسوں میں آپس[...]
کے مباحثہ اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

مخالفت

دشمنی اور عداوت، حسد اور رنجش، اور ناراضی کے سوا، ایک اور جذبہ انسان میں ہے، جو خود اس شخص میں کینہ عادتیں اور رذیل اخلاق پیدا کرتا ہے۔ اور بعوض اس کے کہ وہ اپنے مخالف کو کچھ نقصان پہونچادے، خود اپنا آپ نقصان کرتا ہے۔ اس انسانی جذبہ کو ہم مخالفت کہتے ہیں۔

دشمنی اور عداوت کا منشاء اکثر اتلاف حقوق کے سبب سے ہوتا ہے۔ زن یا زر، زمین یا خون، اس جذبہ کے جوش میں آنے کے باعث ہوتے ہیں۔ حسد کا منشاء صرف وہ اوصاف حمیدہ ہوتے ہیں، جو محسودمیں ہیں، اور حاسد اُنکا خواہاں ہے، مگر وہ اس میں نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ رنجش اور ناراضی اکثر باہمی معاشرت میں خلل واقع ہونے سے ہوتی ہے۔ مگر ان سب کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے، جو بغیر ان سببوں کے جوش میں آتا ہے۔ اس کا منشاء نہ زر و زمین و زن کی دشمنی ہوتی ہے، اور نہ مخالف کے اوصاف حمیدہ کی خواہش ہوتی ہے! کیونکہ یہ شخص اپنے مخالف کے اوصاف حمیدہ کو اوصاف حمیدہ ہی نہیں تصور کرتا، اور نہ باہمی معاشرت کا خلل اس کا باعث ہوتا ہے، اسلیے کہ اکثر ان دونوں میں ملاقات اور واقفیت بھی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا منشاء صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کی مخالف رائے، یا عقل و سمجھ، دوسرے فریق کی رائے اور سمجھ سے مخالف ہوتی ہے۔

یہ جذبہ مخالفت قریباً کل انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر مہذب اور تربیت یافتہ اور نیک دل آدمیوں میں اس کا ظہور اور طرح پر ہوتا ہے! اور نامہذب

اور ناتربیت یافتہ، بدذات آدمیوں میں اس کا ظہور دوسری طرح پر ہوتا ہے۔ پہلا اس مخالفت سے ہر قسم کے فائدے اٹھاتا ہے؛ اور دوسرا ان فائدوں سے بھی محروم رہتا ہے، اور دنیا میں خود اپنے تئیں، بدطینت اور کذاب اور نامہذب ثابت کرتا ہے۔

دنیا میں یہ بات تو تقریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر، گو وہ کیسی ہی صحیح و سچ ہو متفق ہو جاویں۔ پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو۔ نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیک دل سے سوچتا ہے؛ اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اس کو چن لوں؛ اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کر لوں؛ اور جب کوئی ایسی بات اس میں نہیں پاتا، تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے، اور ان غلطیوں کو اس طرح پر بتاتا ہے جیسے ایک دل سوز دوست بتاتا ہے۔ کہیں کہیں طبیعت کو تر و تازہ کرنے کے لئے نہایت دل چسپ ظرافت بھی کر بیٹھتا ہے، اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی بول اٹھتا ہے، اور باوجود مخالفت کے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔

کمینہ طبیعت اور نامہذب ناشایستہ آدمی یہ رستہ نہیں چلتا۔ وہ بات کے حسن و قبح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، بلکہ اپنے مخالف کے عیوب ذاتی سے بحث کرنے لگتا ہے۔ سخت کلامی، و زشت گوئی، سب و شتم اپنا پیشہ کر لیتا ہے۔ اپنے مخالف کے عیوب واقعی ہی کے بیان پر بس نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کے بہتان اس پر لگاتا ہے، اور جھوٹی جھوٹی باتیں اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور خود مورد "لعنت اللہ علی الکاذبین" بنتا ہے۔

پس انسان کو چاہیئے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راست بلندی، نیکی، اور نیک دل کو کام میں لاوے، کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے۔

کاہلی

یہ ایک ایسا لفظ ہے، جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا! کام کاج، محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں سُستی کرنا! کاہلی ہے، مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قوی کو بے کار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

ہاتھ پاؤں کی محنت اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لئے نہایت ضروری ہے! اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا، ایک ایسی چیز ہے کہ مجبوری اس کے لئے محنت کی جاتی ہے! اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ، اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات کا سامان مہیا کرتے ہیں، بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا، گویا ان کی طبیعتِ ثانی بن جاتی ہے! مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے، وہ اپنے دلی قوتے کو بے کار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں، اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں! اور ہزاروں پڑھے لکھوں میں سے شاید کسی ایک کو ایسا موقع ملتا ہو گا کہ اپنی تعلیم کو، اور اپنی عقل کو ضرورتاً کام میں لاوے۔ لیکن اگر انسان ان عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے، اور اپنے دلی قوی کو بے کار ڈال دے، تو وہ نہایت سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے۔

انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے! اور جبکہ اس کے دلی

قوی کی تحریک سست ہو جاتی ہے، اور کام میں نہیں لائی جاتی، تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے۔ پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قوی کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور ان کو بے کار نہ چھوڑے۔

ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو، جس کی آمدنی اس کے اخراجات کو مناسب ہو، اور اس کے حاصل کرنے میں اس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے، جیسا کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور لاخراج داروں کا حال تھا! اور وہ اپنے دلی قوی کو بھی بے کار ڈال دے، تو اس کا کیا حال ہوگا؟ یہی ہوگا! کہ اس کے عام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاویں گے۔ شراب پینا اور مزیدار کھانا اس کو پسند ہوگا۔ قماربازی اور تماش بینی کا عادی ہوگا۔ اور یہی سب باتیں اس کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں! البتہ اتنا فرق ہوتا ہے کہ وہ پھوہڑ، بدسلیقہ، وحشی ہوتے ہیں، اور یہ ایک وضع دار وحشی ہوتا ہے۔ شراب پی کر پلنگ پر پڑے رہنا، اور پیچوان کے دھوئیں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے! اور جنگل کے ریت پر پڑے رہنا اور ناریل میں تمباکو کے دھوئیں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے۔ پس پیچوان اور ناریل، بچھونے اور ریت، کے فرق سے کچھ مشابہت میں، جو ان دونوں میں ہے، کمی نہیں ہوتی۔

ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لئے ایسے کام بہت کم ہیں، جن میں ان کو قوائے دلی، اور قوتِ عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے! اور برخلاف اس کے، اور ولایتوں میں وہاں کے لوگوں کے لئے ایسے موقعے بہت ہیں۔ اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے، یعنی اپنے دلی قوی کو بیکار چھوڑ دیا ہے۔

اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوتِ عقل کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو اسی کی فکر اور کوشش چاہیئے کہ وہ موقع کیونکر حاصل ہو؟ اگر اس کے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے، تو اسی کی فکر اور کوشش چاہیئے کہ وہ قصور کیونکر رفع ہو؟ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بے کار پڑا رہنا نہ چاہیئے۔

کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے، تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے؛ اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کو بے کار پڑا رکھنا نہ چھوٹے گا، اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے۔

نہایت حکیمانہ قول ہے کہ ؎

بے کار مباش کچھ کیا کر،
گر کر نہ سکے، تو کچھ کہا کر۔

ہم حق کی پرستش کرتے ہیں
باطل کو نہ ہرگز مانیں گے

مجاہد کو اسکی نیکی کا صلہ ملتا ہے پھل
جہاد بھی اپنی جگہ ہے ایک بڑی عظمت کا عمل
ارشاد سنولوی

غلامی

آزادی اور غلامی آپس میں ایسی نقیض ہیں کہ نہ دونوں کا اجتماع ہو سکتا ہے، نہ دونوں کا ارتفاع۔ اور اس لئے یہ دونوں داخل "مرضیٔ پروردگار" نہیں ہو سکتیں؛ ورنہ خود پروردگار کی مرضی میں تناقض لازم آوے گا، جو اس کی حکمت بالغہ کے شایاں نہیں ہے۔ پس کچھ شبہہ نہیں ہے، کہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی پروردگار کی مرضی کے مطابق ہوگی؛ یا یوں کہو کہ قانونِ قدرت دو نقیضوں کا متقاضی نہیں ہو سکتا، اور اس لئے ان میں سے ایک ہی مقتضائے قانونِ قدرت ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ایک ایسی ہستی بنایا گیا ہے، جس کی فطرت میں آزادی اور خودمختاری رکھی گئی ہے۔ وہ ذی عقل اور ذی شعور ہے۔ اس کو تمام قوائے ظاہری و باطنی دئے گئے ہیں۔ اُن کے استعمال پر، جس طرح وہ چاہے، قادر ہے۔ تمام کاموں کے شروع کرنے کی سمجھ، اور ان کے انجام کی سوچ، اس کو دی گئی ہے؛ تاکہ ہر کام کا آغاز اور انجام سوچ لے۔ اس کی فطرت ایسی ہے، کہ اپنے لئے آپ تمام چیزیں مہیا کرنے کے لئے حاجتمند ہے۔ پس یہ تمام چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اِس پُتلے کے صانع کی مرضی یہی تھی کہ یہ پتلا خود اپنا آپ مالک رہے۔

صانع نے یہ تمام قویٰ جو انسان کو عطا فرمائے ہیں، اُن سے اس کی مرضی یہ معلوم ہوتی ہے، کہ وہ تمام قویٰ انسان میں اس طرح پر شگفتہ اور شاداب رہیں کہ اعتدال سے خارج نہ ہونے پاویں، اور ایک دوسرے کی نقیض نہ ہو جاویں۔

غلامی

انسان کی ذاتی محنت اسی کے لئے سود مند ہو۔ غلامی کی حالت میں انسان کے بہت سے قوی، بعوض شگفتہ و ترو تازہ رہنے کے، پژمردہ، بلکہ محض معطل و بے کار، ہو جاتے ہیں! اس کی محنت اس کی سودمندی کے لئے نہیں رہتی! پس کسی طرح ایسی حالت صانع کی مرضی نہیں ہو سکتی۔

انسان کی وہ چیز جس سے انسان انسان کہلاتا ہے، اور جس کا نام لوگ روح رکھتے ہیں، گر اس کی حقیقت کچھ نہیں بتلا سکتے، ایسی شریف چیز ہے، کہ کسی کی مملوک ہونے کی لیاقت ہی نہیں رکھتی۔ کیا نتائج قانونِ قدرت، یا خدا کی روح، یا 'اَمرِ ربّ' کسی کی ملکیت ہو سکتی ہے؟ کیا ہم سی ہی ایک مخلوق ہماری ملکیت میں آ سکتی ہے؟ حاشا وَ کلّا!

پس صاف عیاں ہے کہ غلامی اس قادرِ مطلق کی مرضی اور قانونِ قدرت دونوں کے برخلاف ہے۔ تمام انسان آزاد اور یکساں پیدا ہوئے ہیں! اور کچھ شبہ نہیں کہ زندگی اور آزادی اور خوشی حاصل کرنے میں یکساں اور 'غیر قابلِ انتقال' استحقاق رکھتے ہیں۔

مگر انسان کی بدبختی سے کوئی نسل، اور کوئی زمانہ، ایسا نہیں گزرا کہ غلامی کی مصیبت انسانوں میں نہ رہی ہو۔ بہت عقلمند اور دانا اور حکیم گزرے! بہت سے صاحب شریعت گزرے! مگر بجز ایک (محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اور کسی نے اس قانونِ قدرت کے مخالف کا کچھ تدارک نہ کیا۔ موسیٰ صلوات اللہ علیہ نے اس کو جائز رکھا۔ عیسیٰ علیہ السّلام نے اس کی نسبت ایک حرف بھی نہیں کہا۔ یونانی حکیموں نے از روئے اصول اخلاق کے حالت غلامی کی نسبت کوئی اعتراض ہی نہیں سمجھا۔ ارسطو، باوصف اس دانائی کے، یہ سمجھا کہ خود خدا نے انسان کو آزادی اور غلامی میں تقسیم کیا ہے۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ جن لوگوں کو غلام بنایا جاتا ہے وہ ایک قسم ہی جدا ہے۔ اول تو یہ سمجھ ہی اس بڑے حکیم کی، جو ہر طرح ہمارے ادب کے لائق ہے، غلط تھی! اور سوائے اس کے، اس نے یہ

خیال نہ کیا کہ غلامی کسی خاص قوم پر مخصوص نہیں رہ سکتی۔ افلاطون اس سے بھی زیادہ غلطی میں گرا، جب اس نے یہ کہا کہ صرف یونانی غلام نہ ہونے چاہئیں!

زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ایک فیاض شخص (محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا اصولِ مقررہ، جس نے آئندہ غلامی کی جڑ کو کاٹا، اور غلاموں کی حالت کو سنوارا، اور جہاں تک ممکن ہوا اُن کو آزادی کا خلعت پہنایا، ایسا غفلت میں پڑا رہا کہ بہت ہی کم اس پر خیال ہوا۔

عورتوں کے حقوق

تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں، اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں! کوئی وجہ نہیں کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جاوے۔ اگر، تمثیلاً کہا جاوے، کہ عورت انسان کے لیئے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے! اور مرد، بمنزلہ دائیں ہاتھ کے: یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ سُوز آنے کے ہے! اور مرد، بمنزلہ روپیہ کے، تو بھی اس پر راضی نہیں ہوتے۔

بایں ہمہ، ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے، اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے؛ اُس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ مسلمانی قانون میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق اور اختیار تسلیم کیئے گئے ہیں۔

حالتِ نابالغی میں جس طرح مرد، اُسی طرح عورت، بے اختیار اور ناقابل معاہدہ متصوّر ہے! الّا بعد بلوغ، وہ بالکل مثل مرد کے مختار ہے اور ہر ایک معاہدہ کے لائق ہے۔

جس طرح مرد، اسی طرح عورت، اپنی شادی کرنے میں مختار ہیں! جس طرح کہ مرد کی بے رضامندی نکاح نہیں ہو سکتا! اسی طرح عورت کی بلا رضامندی نکاح نہیں ہو سکتا۔

وہ اپنی تمام ذاتی جائداد کی خود مالک اور مختار ہے! اور ہر طرح اس میں تصرّف کرنے کا اس کو اختیار کامل حاصل ہے۔

وہ مثل مرد کے ہر قسم کے معاہدے کی صلاحیت رکھتی ہے؛ اور اس کی ذات، اور اس کی جائداد، اُن معاہدوں اور دستاویزوں کی بابت جوابدہ ہے، جو اس نے تحریر کی ہوں۔

جو جائداد، قبل شادی اور بعد شادی اس کی ملکیت میں آئی ہو، وہ خود اس کی مالک ہے، اور خود اس کے محاصل کی لینے والی ہے۔

وہ مثل مرد کے دعویٰ بھی کر سکتی ہے، اور اس پر بھی دعویٰ ہو سکتا ہے۔

وہ اپنے مال سے ہر ایک چیز خرید سکتی ہے، اور جو چاہے اس کو بیع کر سکتی ہے۔ وہ مثل مرد کے ہر قسم کی جائداد کو ہبہ، اور وصیت، اور وقف کر سکتی ہے۔

وہ رشتہ داروں اور شوہر کی جائداد میں سے بہ ترتیب وراثت، ورثہ پا سکتی ہے۔

وہ تمام مذہبی نیکیوں کو جو مرد حاصل کر سکتا ہے حاصل کر سکتی ہے۔

وہ تمام گناہوں اور ثواب کے عوض میں دنیا اور آخرت میں، وہی سزا و جزا پا سکتی ہے جو مرد پا سکتا ہے۔

پس، حقیقت میں، مذہب اسلام میں جس طرح کہ عورت و مرد کو برابر سمجھا ہے، ویسا نہ کسی مذہب میں ہے، اور نہ کسی قوم کے قانون میں ہے؛ مگر تعجب اور کمال تعجب اس بات پر ہے کہ تمام تربیت یافتہ ملک، مسلمانوں کی عورتوں کی جو حالت ہے، اس پر بہت کچھ نام رکھتے ہیں، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تربیت یافتہ ممالک کی عورتوں کی حالت، مسلمانوں اور مسلمان ممالک کی عورتوں کی حالت سے بدرجہا بہتر ہے، حالانکہ معاملہ بالعکس ہونا چاہیئے تھا۔

عورتوں کی حالت کی بہتری جو تربیت یافتہ ملکوں میں ہم نے تسلیم کی ہے، اس میں کچھ بھی خیال ہم نے بے پردگی کی آزادی کا نہیں کیا ہے، کیونکہ ہماری رائے میں ہندوستان میں اس باب میں جسقدر کہ تفریط ہے، اسیقدر تربیت یافتہ ملکوں میں افراط

ہے؛ اور جو حد کہ شرع نے مقرر کی ہے، اور جہاں تک انسان اس پر غور کر سکتا ہے، اور اپنی عقل کو کام میں لا سکتا ہے، بلاشبہہ وہی حد نہایت درست اور ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔

اس مقام پر جو ہم کو بحث ہے، وہ صرف مردوں کے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک، اور حسنِ معاشرت، اور تواضع، اور خاطر داری، اور محبت، اور پاسِ خاطر، اور ان کی آسائش، اور آرام، اور خوشی، اور فرحت کی طرف متوجہ ہونا؛ اور ان کو ہر طرح پر خوش رکھنا، اور بعوض اس کے کہ عورتوں کو اپنا خدمتگذار تصور کریں، ان کو اپنا انیس اور جلیس، اور رنج و راحت کا شریک؛ اور اپنے کو ان کی، اور اُن کو اپنی، باعثِ مسرت اور تقویت کے سمجھنے پر؛ بحث ہے۔ بلاشبہہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے، تربیت یافتہ ملکوں میں عورتوں کے ساتھ یہ تمام مراتب بخوبی برتے جاتے ہیں؛ اور مسلمان ملکوں میں ویسے نہیں برتے جاتے، اور ہندوستان میں تو ایسی نالائقی اور خاک اڑتی ہے کہ نعوذُ باللہ مِنہا!

ہندوستان میں، جس قدر کہ عورتوں کی حالت میں تنزل ہے صرف اس کا باعث احکام مذہب اسلام کی بخوبی پابندی نہ کرنا ہے۔ اگر ان کی پابندی کی جاوے تو بلاشبہہ یہ تمام خرابیاں دور ہو جاویں۔ معہٰذا بڑا باعث اس کا اَن سولائزڈ، یعنی نامہذب ہونا، مسلمانوں کا ہے۔

مہذب قوموں نے، باوجودیکہ ان کے ہاں کا قانون نسبت عورتوں کے نہایت ہی ناقص اور خراب تھا، اپنی عورتوں کی حالت کو نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی پر پہونچایا ہے؛ اور مسلمانوں نے، باوجودیکہ اُن کا مذہبی قانون نسبت عورتوں کے، اور ان کی حالت بہتری کے تمام دنیا کے قوانین سے بہتر اور عمدہ تھا، مگر انہوں نے اپنے نامہذب ہونے سے ایسا خراب برتاؤ عورتوں کے ساتھ اختیار کیا ہے، جس کے سبب تمام قومیں ان کی حالت پر ہنستی ہیں؛ اور ہماری ذاتی برائیوں کے سبب، اس وجہ سے کہ قوم کی قوم ایک حالت پر ہے، اِلّا ما شاء اللہ، اس قوم کے مذہب پر عیب لگاتی ہیں۔

پس اب یہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم ان باتوں کی غیرت نہ کریں، اور اپنے چال چلن کو درست نہ کریں؛ اور جیسا کہ مذہب اسلام روشن ہے، خود اپنے چال چلن سے اس کی روشنی کا ثبوت لوگوں کو نہ دکھائیں.

پردہ

اِن دنوں میں عورتوں کے پردہ کی نسبت متعدد تحریرات اخباروں میں شائع ہوئی ہیں! اور ہمارے بعض عزیز، جنکو ہم "نمک لحمی" کہہ سکتے ہیں، پردے کے مخالف ہیں۔ مگر ہم کو، گو لوگ نئے فیشن کا نہ سمجھیں، مگر ہم تو اُسی پُرانے دقیانوسی، اگر فیشن کے نہیں ہیں، تو دقیانوسی مزاج، کے تو ضرور ہیں، اور اس لئے ہم اپنے مخدوموں کی رائے کے مخالف ہیں! اور عورتوں کا پردہ جو مسلمانوں میں رائج ہے، اس کو نہایت عمدہ سمجھتے ہیں.

اس بات پر بحث کرنی، کہ قرآن مجید سے پردہ، مروجہ عورات اہل اسلام ثابت ہوتا ہے یا نہیں، محض فضول ہے! کیونکہ، اگر مسلمان مرد اپنے افعال و عادات میں پابند شریعت اور تابع احکام قرآنی ہوتے، تو اس وقت عورتوں کے پردے کی بابت اس بات کی گفتگو کرنی، کہ قرآن مجید سے مروجہ پردہ ثابت ہے یا نہیں، زیبا ہوتی۔ مگر، جب ہمارے مردوں کی نسبت قرآن مجید کے کسی امر کے اتباع کی نسبت بحث نہیں کی جاتی، تو عورتوں کے پردے کی نسبت یہ بحث کرنی کہ قرآن مجید سے ثابت ہے یا نہیں، کیسی نازیبا معلوم ہوتی ہے! پہلے تم اپنے تئیں تو کسی لائق بنالو! پھر عورتوں کی طرف متوجہ ہونا!

تو کارِ زمیں را نکو ساختی،
کہ با آسماں نیز پرداختی.

تربیت اطفال

اگر ہم اس بات پر خیال کریں کہ انسانوں کے عیوب، مثل کالے بادلوں کے، جمع ہو کر ہم ہی پر برستے ہیں، تو دنیا سے انسانوں کے عیوب بہت کم ہو جاویں! اور اگر ہم مرے ہوئے لوگوں کی آواز پر کان دھریں، اور سمجھیں کہ وہ قبروں میں پڑے ہوئے زبانِ حال سے کیا کہہ رہے ہیں، تو شاید ایک بھی بُرائی دنیا میں نہ رہے۔

افسوس! کہ ہماری آنکھیں اندھی اور ہمارے کان بہرے ہیں!

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب وقت گزر جاتا ہے، تو بہت سی باتوں کا پچھتاوا آتا ہے، کہ افسوس! ہم نے یہ نہ کیا، اور وہ نہ کیا! اور اس وقت پچھتانے سے کیا ہوتا ہے، کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا، اور لاعلاج رنج کا نہایت ہی جانکاہ رنج ہوتا ہے۔ پس، اگر ہم ایسے سخت رنج سے بچنا چاہیں، تو اس کا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ وقت کو غنیمت جانیں ؎

غنیمت داں ہمیں دم را کہ حالست!

یہ بات جو ہم نے کہی ٹھیک انسانوں کی طفولیت کی حالت سے نہایت ہی مناسبت رکھتی ہے! اس لیے، کہ جو عمر اور وقت تربیت کا ہے، جب وہ گزر جاتا ہے، تو بجز لاعلاج رنج رہ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا! اور پھر ان کا ناتربیت یافتہ رہنا مثل کالی گھٹا کے ہم پر کڑکتا ہے، اور ہم پر برستا ہے! اور کسی کے گھر کو بہا دیتا ہے اور کسی کے خانماں کو جلا دیتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام چیزوں میں قدرتی تبادلہ ہوتا رہتا ہے؛ اور بجز انسان کے ایسی اور کوئی چیز نہیں ہے، جس کو اس تبادلہ میں کچھ دخل ہو۔ اگرچہ

انسان کو کسی چیز کے پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے، مگر اس میں اتنی قدرت ہے کہ بہت سی چیزوں کو اپنے اختیار اور قابو میں کر کر، اس قدرتی تبادلہ میں شریک ہو۔ انسان ہی ایسا وجود ہے، جو تھوڑا بہت کارخانۂ قدرت کے بگاڑنے یا سنوارنے میں دخل رکھتا ہے۔ وہی ایسا ذی عقل اور ذی شعور مخلوق ہے، کہ دنیا کی آئندہ کی رفتار کو روک سکتا ہے! یا ترقی کر سکتا ہے! یا ابتر و خراب حالت میں ڈال سکتا ہے۔

یہ اقتدار اس ناکامل اور فانی وجود کا، جیسا کہ لڑکوں کے تربیت یافتہ یا ناتربیت یافتہ رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے، ایسا اور کسی چیز سے ظاہر نہیں ہوتا۔ جبکہ ہم لڑکوں کی حالت پر غور کرتے ہیں، اور ان کی بھولی بھالی اور سیدھی سادی طبیعتوں کو ہر ایک قسم کے گناہ سے پاک ہوتے ہیں، اور ہر قسم کی تربیت کی استعداد اُن میں دیکھتے ہیں، تو ہم کو خدا کی کامل قدرت کا نمونہ دکھائی دیتا ہے، اور یقین ہوتا ہے، کہ وہ اس ذاتِ کامل کی دلی بخشش کی ہوئی چیزیں ہیں۔ اس کے بعد، ایک زمانہ تک وہ ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ ہمارے سامنے ان کی عقل و فہم کی ترقی ہوتی ہے، اور ہماری تعلیم و تربیت ان میں اثر کرتی ہے۔ اور، یا تو اچھی اچھی مثالوں کے دیکھنے سے شروع ہی سے اُن میں عمدہ عمدہ عادتیں اور خصلتیں بیٹھ جاتی ہیں، اور یا بُری بُری نظیروں کے دیکھنے سے شروع ہی سے ان میں بدعادتیں اور خراب خصلتیں پڑ جاتی ہیں۔ بہرحال لڑکپن کا موسم نکل جاتا ہے! اور جو کچھ کہ لڑکوں نے ہماری صحبت اور تربیت سے نیک یا بد حاصل کیا ہو، اس کا اثر دنیا میں رہ جاتا ہے۔

لڑکپن کے زمانہ میں، جو عمر کے سات برس سے پندرہ[15] برس تک ہے، وہی ایسا زمانہ زندگی کا ہے، جس میں آئندہ کی بہبودی کے لئے زیادہ تر کوشش ہو سکتی ہے۔ اس زمانہ میں لڑکوں کا دل ہر چیز کا متلاشی رہتا ہے! حافظہ تیز ہوتا ہے! قوتِ غور مضبوط ہوتی ہے! اچھی عادتوں کا دیکھنا، اور عمدہ عمدہ نظیروں سے تربیت پانا، جس کو عموماً نیک صحبت کہتے ہیں: نہایت ہی مؤثر ہوتا ہے۔ یہ زمانہ لڑکوں کے لئے ذہنی، عقلی اور اخلاقی تخم ریزی کا ہوتا ہے! کیونکہ اس وقت تعلیم کو دل نہایت جلد قبول،

کرتا ہے، اور اس کے تخم کو، جس میں آئندہ نہایت عمدہ عمدہ پھل پھول پیدا ہوں گے، بہت جلد اُگا دیتا ہے۔ لیکن اگر اس زمانہ میں تربیت نہیں ہوتی، تو پھر بہت ہی کم فائدہ ہوتا ہے! کیونکہ جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں، عادت میں مضبوطی آتی جاتی ہے! یہاں تک کہ آخر کار عادت طبیعت سے مل جاتی ہے، اور "طبیعتِ ثانی" کہلاتی ہے، جس کا بدلنا نہایت ہی دشوار ہے۔

ایک نہایت لائق شخص کا حکیمانہ قول ہے کہ:

"لڑکپن کی طبیعت کتنے بڑے امر اہم کی چیز ہے، کہ آئندہ کی بھلائی یا برائی اُسی کی احتیاط و غیر احتیاط پر منحصر ہے، جو لڑکوں کے مربیوں کی طرف سے ہوتی ہے۔"

پس جو لوگ کہ قومی تربیت یا قومی ترقی کے خواہاں ہیں، ان کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ لڑکوں کی تربیت کے لئے عمدہ انتظام کریں، جن سے ہم کو آئندہ کی بہبودی کی توقع ہے! ورنہ ہم پر یہی مثل صادق آتی ہے کہ "میاں! کہیں بوڑھے طوطے بھی پڑھے ہیں۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں تربیت اطفال کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے! اور بڑا سبب اُن کی حالت کے تباہ ہونے اور اولاد کے نالائق رہنے یا آوارہ ہو جانے کا یہی ہے۔ ہم ان حالتوں کا ذکر نہیں کرتے، جن میں اطفال آوارہ اور خراب ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس کو تو سب بُرا جانتے ہیں! بلکہ ہم تو اس حالت کا ذکر کرتے ہیں جس میں غلطی سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری اولاد نے خوب تربیت پائی ہے۔ غلطی اس لئے ہے کہ حقیقت میں وہ تربیت عمدہ تربیت نہیں ہے! اور یہی سبب ہے کہ ان کو کچھ لیاقت نہیں آتی، اور ان کے دل میں اخلاقی فیاضی اور طبیعت کی آزادگی اور دل کی کشادگی پیدا نہیں ہوتی۔ تمام قویٰ، جو اُن میں خدا تعالیٰ نے رکھے ہیں، سب پژمردہ اور ناکارہ رہ جاتے ہیں! اور رفتہ رفتہ، اُن میں وہ قویٰ، جن سے انسان اپنے کسی زمانۂ عمر میں نام آور، اور دل چلا، اور عالی حوصلہ، غیرت والا ہوتا ہے، باقی نہیں رہتے۔

مسلمانوں میں اگر کسی شخص کی اولاد عوام الناس کے لونڈوں میں کھیل کود سے بچے، اور اپنے ہی ہم جولیوں میں رہے، اور اپنے یا اپنے ہمسر خاندان کی صحبت اٹھائے، اور

دوزانو بیٹھنا اور جھک کر سلام کرنا، یا عین کو ٹھیک مخرج سے نکال کر "سلامٌ علیک" کرنا اور ہاتھ جوڑ کر مزاج شریف پوچھنا سیکھ جاوے، تو نہایت سعادت مند اور تربیت یافتہ گنا جاتا ہے؛ اور جب اس کے ساتھ اس کو کچھ لکھنا پڑھنا بھی آتا ہو، اور کسی میاں جی یا مُلّا سے پڑھتا بھی ہو، تو وہ تربیت کے کنگورہ پر پہنچا ہوا سمجھا جاتا ہے! اور اگر بخت و اتفاق سے اس نے دو چار کتابیں زیادہ پڑھ لیں، اور "صدرہ، شمس بازغہ" پڑھنے لگے، تو پھر تو باوا جان پھولے بھی نہیں سماتے، اور لڑکے کا "میاں مولوی" اور "میاں فاضل محمد" کے سوا اور کوئی نام ہی نہیں لیتے۔

مگر صرف اتنا ہی، جتنا کہ بیان ہوا، کافی نہیں ہے؛ بلکہ مفید تربیت ہونے کے لئے اور بہت کچھ ہونا چاہیئے۔ پس اگر غور سے دیکھا جاوے اور انصاف کیا جاوے تو یہ تربیت کچھ تربیت نہیں ہے۔ ایسی تربیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکوں کے خیالات مثل جانوروں کے خیالات محدود ہو جاتے ہیں، اور کسی قسم کی ترقی کا مادہ اُن میں نہیں رہتا۔ اُن کی حرکات مودّبانہ صرف ایسے بندر کی سی حرکات ہوتی ہیں، جس کو سلام کرنا، اور ادب سے بیٹھنا، اور کھڑے رہنا سکھایا ہو۔

ان حرکات میں ان اخلاقی اوصاف کا، جن سے از خود حرکات انسانی بلا تصنّع قدرتی ادب و اخلاق کے مقتضیٰ پر ہوتی ہیں، کچھ بھی اثر نہیں پایا جاتا! بلکہ انسان میں جو ایک مہذب دلیری اور مودّب بہادری اور ممدوح خودداری ہونی چاہیئے، جس کو مختصر لفظ "غیرت" سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایسے ادب سکھانے سے باقی نہیں رہتی۔ اس کی طبیعت، بعوض اس کے کہ بلند ہونے پر مائل ہو، پست ہونے پر رجوع کرتی ہے، جس کا بد اثر اس کی آئندہ عمر میں ظاہر ہوتا ہے۔ پڑھنا لکھنا آجانے سے، اور منطقی یا فلسفی ہو جانے سے، کامل تربیت خیال نہ کر لینی چاہیئے، قطع نظر اس کے کہ علوم غیر مفید، کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتے۔

صرف پڑھ لکھ لینے سے تربیت کامل نہیں ہو جاتی۔ بہت سے پڑھے لکھے ایسے موجود ہیں، جو بلحاظ تربیت کے، محض ایک کندۂ ناتراش ہونے سے کچھ زیادہ تر نہیں

رکھتے۔ پس تربیت کامل کے لئے جیسا کہ علوم مفیدہ کا پڑھنا شرط ہے، ویسا ہی اسکے ساتھ لڑکے کی زندگی کا ایسے طور پر اور ایسی حالت پر بسر ہونا ضرور ہے، جس سے روز بروز اس کے خیالات کو وسعت ہوتی جاوے، اس کی امنگ بڑھتی جاوے، اُس کے قویٰ شگفتہ و شاداب رہیں۔ غیرت، جو ایک بڑا جوہر انسان کا ہے، اور برائیوں سے بچانے کے لئے نہایت عمدہ اور سچا محافظ ہے، ہمیشہ ترقی پر رہے۔ ظاہری اخلاقی اور مودبانہ حرکات، اوپر اوپر، مثل روغن قاز کے نہ لگائے جاویں، بلکہ مثل چشمہ شیریں کے خود اندر سے نکلیں۔

نماز و روزہ، اور کتب مذہبی کا پڑھنا، فی نفسہ نہایت عمدہ چیز ہے! مگر جب اس کی تعلیم ایسے بد طریقے سے ہوتی ہے، جیسے کہ اب مسلمانوں میں مروّج ہے، اس سے بجز اس کے کہ بد تعصبات بڑھ جاویں! اور بعوض نیکی اور نیک دلی کے، صفاتِ ذمیمہ ترقی پکڑیں، اور مثل کانٹے دار سخت پوست کے دل کو گھیر لیں، جس میں نیکی اور رحم اور رقت اور ہمدردی سچائی اور راستبازی مطلق اثر کرنے نہ پائے، اور کچھ نتیجہ نہیں ہوتا۔ ایسا تربیت یافتہ شخص، بجائے اسکے کہ فخرِ اسلام ہوتا، ننگِ اسلام ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو جہاں اپنی اولاد کی تعلیم کی فکر ہونی چاہیئے، اسی کے ساتھ اس بات کی بھی بہت بڑی فکر لازم ہے، کہ زمانۂ تربیت اور تحصیلِ علم میں لڑکوں کی زندگی بسر کرنے کی کیا تدبیر کرنی چاہیئے، جس سے مقاصد مذکورہ بخوب ترین وجوہ حاصل ہوں۔

راست باز، متدین، پرہیزگار، عالی ہمت، مستقل مزاج، اور رنج و مصیبت میں ثابت قدم، ہونے کے لیے یہ بات ضرور ہے کہ لڑکوں کا دل اور ان کی طبیعت ان صفات پر بخوبی حاوی ہو جاوے! ورنہ تمام پند و نصائح اور نماز و روزہ نقش بر آب ہوتا ہے، اور نہایت جلد سب میں فتور آجاتا ہے، اور تمام زندگی کی امیدیں اور بہبودیاں جاتی رہتی ہیں۔ اور اس کا سبب صرف یہی ہے کہ اُن سے کہا گیا، پر اُن کو سمجھنے نہیں دیا گیا، کہ فلانی چیز درحقیقت عمدہ ہے، اور ہر چیز کی قدر صرف اس کی

عمدگی ہی پر منحصر ہے۔

اگرچہ لڑکوں کی تعلیم کا فرض مقدم اُن کے ماں، باپ پر ہے، مگر جیسی تعلیم کہ مطلوب ہے، وہ بغیر اس کے کہ تمام قوم آپس میں متفق ہو کر اس کو قائم نہ کرے، ممکن نہیں ہے! اور اس لئے وہ فرض تمام قوم سے متعلق ہوتا ہے! اور کچھ شک نہیں ہے کہ ایسے سامان تعلیم کے موجود نہ ہونے سے تمام قوم گنہگار اور شرمسار ہے! اور اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ اب لوگ ہوشیار ہوں گے، اور اس فرض کفایہ کے پورا کرنے پر جو بسبب ضرورت و حاجت شدید کے رتبہ میں فرض عین سے زیادہ بڑھ گیا ہے، توجہ فرمائیں گے۔

ہمارے بعد ہمارا نام رہے گا

یہ ایک نہایت لغو اور بیہودہ خیال ہے، جس کا کچھ نتیجہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بہت لوگ اس لغو خیال میں مبتلا ہیں: کوئی اولاد چاہتا ہے، کہ اس کے بعد اسکا نام چلے؛ کوئی محل بناتا ہے، کہ اس کے بعد اسکا نام قائم رہے؛ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ اس سے فائدہ کیا ہے؟ اگر لوگوں نے کہا کہ یہ قلعہ اکبر کا بنایا ہوا ہے؛ اور وہ قلعہ، شاہجہاں کا؛ تو اس سے مرنے والے کو کیا فائدہ؟ مرنے والا تو مر گیا "اپنی کرنی اپنی بھرنی" اپنے ساتھ لے گیا۔ اب لوگ کچھ ہی کہا کریں؛ جو ہونی بات تھی وہ ہو گئی! سعدی فرماتے ہیں:

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل،

گرچہ بسے گزشت کہ نوشیرواں نماند۔

اس شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ نوشیرواں کے بعد لوگ کہا کرتے تھے کہ نوشیرواں بہت عادل تھا۔ مگر یہ نہ کھلا کہ اس سے نوشیرواں کو کیا فائدہ ہوا؟ پس لوگوں کو جو یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمارے بعد ہمارا نام قائم رہے، یہ کیوں ہوتی ہے؟ اور اس سے ان کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟ ہمارے نزدیک تو یہ محض خیال خام ہے، اور انسان کے دل کے بودے پن کی دلیل ہے۔

انسان کو ہمیشہ یہ خیال رہنا چاہیے کہ میں کوئی ایسا کام کر جاؤں جس سے انسانوں کو، قوم کو، فائدہ پہونچتا رہے؛ مثلاً، کسی علم کا ایجاد کرنا، کسی ہنر کا پیدا کرنا، یا کوئی ایسی بات ایجاد کرنا جو لوگوں کو فائدہ مند ہو۔ یہ خیال بہت صحیح ہے، کیونکہ اپنی ذات کے واسطے نہیں ہے؛ خصوصاً، جبکہ وہ ذات بھی فنا ہو جائے؛ بلکہ زندوں

کے لئے، اور الیسوں کے لئے ہے، جنکا سلسلہ برابر قیامت تک جاری رہے گا.
پس ہمارے خیال میں اس سے زیادہ انسان کے لئے کوئی بے وقوفی نہیں ہے،
جو یہ خیال کرے کہ میں ایسا کام کر جاؤں، جس کے بعد میرا نام جاری رہے:

گزشتم از سرِ مطلب، تمام شد مطلب؛
حجابِ چہرۂ مقصود بود مطلبہا.

گزرا ہوا زمانہ

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراونی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے، اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے؛ مگر اس کا غم، نہ اندھیرے گھر پر ہے، نہ اکیلے پن پر، اور نہ اندھیری رات، بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر؛ اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے، اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے، اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر، آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے جبکہ: اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر، دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر، ماں باپ، بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لئے، چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں، کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا، اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا:

"ہائے وقت! ہائے وقت!! ہائے گزرے ہوئے زمانے!! افسوس!
کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا!"

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا: اپنا سرخ و سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ سے بھرا ہوا دل، جذباتِ انسانی کے جوشوں کی خوشی، اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں

میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانہ میں، ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے، اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتلاتے تھے، وہ یہ کہتا تھا:

"ابھی! ابھی بہت وقت ہے۔"

بڑھاپا آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا، اور افسوس کرتا تھا کہ:

"کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا، اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا، اور موت کے لیے تیار رہتا! آہ! وقت گزر گیا! آہ! وقت گزر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے؟ افسوس! میں نے اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر دیا دیا کہ 'ابھی وقت بہت ہے'۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا، اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی۔ دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں۔ تب وہ چلّا کر بولا:

"ہائے! ہائے!! میری گذری ہوئی زندگی بھی ویسی ہی ڈراؤنی ہے، جیسی یہ رات۔"

یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے، جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے، آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے، یہ کہتی ہوئی کہ:

"ہائے بیٹا! وقت گذر گیا!"

باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں سے یہ آواز آتی ہے کہ:

"کیوں بیٹا! ہم تمہارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے۔"

بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیئے ہوئے خاموش ہیں، اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

"اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی، بے مروّتی، اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروّت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا، یاد آتا تھا۔ اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا، اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا:

"ہائے وقت نکل گیا! ہائے وقت نکل گیا!! اب کیوں کر اس کا بدلہ ہوگا!"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا، اور ٹکراتا ٹکراتا کھڑکی تک پہونچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے، اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے، پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی، اور پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑپن یاد آیا جس میں: نہ وہ جوانی رہی تھی، اور نہ وہ جوانی کا جوبن؛ نہ وہ دل رسا تھا، اور نہ دل کے ولولوں کا وہ جوش۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانہ کو یاد کیا، جس میں وہ بہ نسبت بدی کے، نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی، اپنی مدد کو پکارتا تھا، مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی۔

وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اس تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر نہ فقیر، کوئی اس کی آواز نہیں سنتا، اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل گھبراتا اور سوچتا کہ:

"میں نے کیا کیا، جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا! یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی

کیوں نہ سوجھی؟ اب کچھ بس نہیں چلتا۔"

اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھتا:

"ہائے وقت! ہائے وقت!! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا؟"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھُل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں۔ اُن کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا، کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی؛ اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔

جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا، وہ قریب ہوتی جاتی تھی؛ یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آگئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا؛ اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجہ سے اس سے پوچھا کہ:

"تم کون ہو؟"

وہ بولی:

"میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔"

اس نے پوچھا کہ:

"تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے؟"

وہ بولی:

"ہاں ہے! نہایت آسان، پر بہت مشکل: جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے؛ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی، اور بڈھا پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا، اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن ۵۵ برس کی عمر میں کوئی کام انسان کی بھلائی، اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا، نہیں کیا تھا۔ اس

کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کیے تھے ثواب کے لالچ، اور گویا خدا کو رشوت دینے، کی نظر سے کیے تھے۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بیقرار چلّا اٹھا:

"ہائے وقت! ہائے وقت!! کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں؟ ہائے میں دس ہزار دینار یں دیتا، اگر وقت پھر آتا، اور میں جوان ہو سکتا!"

یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کو گلے لگا کر، اس کی بتی لی۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔

ماں نے کہا کہ:

"بیٹا! کیوں برس کے برس دن روتا ہے؟ کیوں تو بے قرار ہے؟ کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے؟ اُٹھ! منہ ہاتھ دھو! کپڑے پہن! نوروز کی خوشی منا! تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔"

تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا، اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔

اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سُن کر اس کو جواب دیا:

"بیٹا! بس تو ایسا مت کرنا، جیسا اس پشیمان بڈھے نے کیا؛ بلکہ ایسا کرنا جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔"

یہ سُن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا، اور نہایت خوشی سے پکارا:

"او! یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا، اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا، جس نے ایسا

گزرا ہوا زمانہ

خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا، اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا
نام بتلایا۔ او خدا! او خدا!! تو میری مدد کر! آمین!!"
پس اے میرے پیارے نوجوان ہموطنو! اور اے میری قوم کے بچو!!
اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو! تاکہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچتاؤ!
ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اُٹھے، اور اپنی
قوم کی بھلائی میں کوشش کرے! آمین!!

سراب حیات

صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے؛ عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے۔

چند روز ہوئے کہ میں نے ایک گھنٹہ اپنے کمرہ میں لگایا ہے۔ اس کا لنگر ٹوٹ گیا تھا، وہ بند تھا؛ نہ چلتا تھا، نہ آواز دیتا تھا۔ ایک دوست نے مہربانی سے اس کو بنا دیا۔ وہ چلنے لگا، اور آواز دینے لگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ دن رات چلتا ہے۔ ایک بجے سے بنا دو، وہ شروع کرتا ہے، اور بارہ پر ختم کر دیتا ہے۔ اس کے ایک اُلٹ پھیر میں، دن رات ختم ہو جاتا ہے۔

جب ہم خیال کرتے ہیں کہ "ہم نے کیا کیا؟" تو معلوم ہوتا ہے کہ "کچھ نہیں!" یہی دھن کئی دن سے مجھے لگی ہوئی تھی، اور اسی خیال میں غلطاں پیچاں تھا، کہ یکایک ہمارے دوست، پادری رجب علی نے، ایک کتاب بھیجی، جس کے سرے پر لکھا تھا "سرابِ حیات۔" میں بہت خوش ہوا اور سمجھا کہ شاید اس سے کچھ عقدہ حل ہوگا۔ یہ کتاب، دراصل انگریزی میں ہے، اور "ڈاکٹر جانسن" نے بڑی فصاحت و بلاغت سے لکھی ہے، جس کا ترجمہ "پنڈت بشمبر ناتھ" نے کچھ کمی بیشی کے ساتھ نہایت قابلیت سے اردو زبان میں کیا ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے نہایت لائق اور مشہور، اور عقلمند و دولتمند، اور فصیح و ظریف و شاد، فیاض و بخیل، آدمیوں کا ذکر کیا ہے! اور پھر دکھایا ہے کہ کس طرح حسرت و افسوس سے دنیا سے گئے! تمام مال و دولت چھوڑ گئے! نہ وہ عقلمندی کام آئی، اور نہ وہ متاعِ دنیا! زبانِ حال سے یوں کہتے کہتے مر گئے:

کس لئے آئے تھے، کیا ہم کر چلے! تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے!!

اس کتاب نے بعوض سلجھانے کے میرے خیالات کو اور اُلجھا دیا۔ میں نے اپنے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ ایک خوش نما ندی، اور سرسبز درخت، اور شاداب کھیتی پر میری نظر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ ندی کا پانی بہا چلا جاتا ہے؛ پچھلا آتا ہے اور اگلا چلا جاتا ہے۔ درختوں کو بھی دیکھا، کہ پرانے جاتے ہیں؛ نئے آتے ہیں۔ پکی کھیتی کاٹی جاتی ہے؛ اور نئی بوئی جاتی ہے۔ یہی "آواگون" لگ رہا ہے۔ یہ کس لئے آئے تھے؟ اور کس لئے گئے؟ کیا یہ بھی کچھ حسرتیں لے گئے؟

میں نے شیر کا خیال کیا، جو سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ شجاع، سب سے زیادہ غیور ہے؛ مگر سب میں موذی اور زندہ بہ آزار مشہور ہے۔ جب اس کی مردہ لاش کا میں نے دھیان کیا، تو دیکھا! ایک بے حرکت لاشہ پھول کر پیٹ پھٹا ہوا، انتڑیاں گیدڑوں کی کھائی ہوئی، سنہری کھال خاک میں ملی ہوئی، گوشت گل کر زمین پر پڑا ہوا، ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی ڈھانچہ تھا اور غالباً وہ بھی چندروز کو!

اتنے میں کتے کا مجھے خیال آیا: قناعت، محبت، رفاقت، دوستی، وفاداری، اپنے مالک کی اطاعت، اور سب سے زیادہ کسر نفسی، اسی پر ختم ہے؛ سب دور دور کرتے ہیں، مگر یہ غریب سب کے سامنے عاجزی اور کسر نفسی سے دُم ہلاتا اور سر جھکاتا ہے۔ جب وہ بھی مرا تو ایک لاشۂ بے حرکت تھا۔ نہ دُم کا ہلانا تھا، نہ سر کا جھکانا، نہ وہ رفاقت تھی، نہ وہ اطاعت۔ چندروز میں اسی طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا؛ منہ کھلا، جبڑا ننگا، دانت اور کچلیاں کھلی ہوئیں اور ہزاروں چیونٹیاں اُس میں گھسی ہوئیں!

میں نے کبوتر کا خیال کیا، جو دنیا میں سب سے مقدس شمار ہوتا ہے: نوحؑ کے لئے زیتون کی مبارک ٹہنی لانے والا، مسیحؑ کے لئے روح القدس بن کر اُترنے والا، مکہ معظمہ میں کعبہ کا طواف کرنے والا، تمام خانقاہوں کا مجاور ہو کر رہنے والا، اپنے پروں کی ہوا سے بیماروں کو شفا بخشنے والا، تمام ہندوؤں اور بدھسٹ لوگوں کو جی کے

بچاؤ کی ہدایت کرنے والا! مگر جب اس کا بھی انجام دیکھا تو اس سے زیادہ کچھ نہ پایا! کہ پُر نُچے ہوئے کہیں پڑے ہیں! چونچ کہیں، اور پنجے کہیں! چند روز تک سینہ کا ڈھانچا پڑا ہے، پھر وہ بھی نہیں!

میں نے اپنا خیال انسان کی طرف پلٹا، یکایک میرے سامنے سلطان عبدُالعزیز خاں کا ماجرا آموجود ہوا، جو پندرہ برس سے قسطنطنیہ کے تخت شاہی پر جلوس کرتا تھا. لوگ کہتے ہیں کہ نہایت فضول خرچ تھا. عورتوں پر بہت فریفتہ تھا! ترپّن کشتیاں عورتوں کی بھری ہوئی، اس کی حرم سرا میں تھیں. شاہی خزانہ خالی تھا، مگر اس نے کئی کروڑ روپیہ اپنے خزانہ میں عیاشی کے لئے چھپا رکھا تھا. کیا دیکھتا ہوں کہ اپنے حرموں میں اُسی کی سلطنت کے لوگوں نے اس پر یورش کی! تخت سے اتار دیا! اور محل سے نکال، ایک چھوٹے سے مکان میں قید کر دیا. سلطنت جانے کی حسرت نے اس کے دل کو بیتاب کر دیا، اور اپنے تئیں آپ مار مرا. میں سمجھا کہ اب اس میں کچھ نہیں! چند روز میں یہ گوشت پوست بھی نہ ہوگا، صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جاویگا! اور چند روز بعد وہ بھی نہ ہوگا. مجھے 'جانسن' کی "سراب حیات" یاد آئی اور سمجھا کہ دنیا کی حسرت میں مرا، اسلئے اس کا یہ حال ہوا.

پنجاب کا ایک نہایت متبرک شخص میری آنکھوں میں پھر گیا. خدا کے سوا اور کچھ کلام نہ تھا. عبادت کے سوا اور کچھ کام نہ تھا. دنیا اور اس کا عیش محض بے حقیقت تھا. جو لَو تھی، وہ خدا سے دُعْقبے سے لگی ہوئی تھی. اُن کا بھی آخری وقت آپہونچا. اپنی اوّل منزل کی انہوں نے وصیت کی، اور اپنے دوستوں کو نصیحت. نہایت شاداں و فرحاں سفر کی تیاری کی، اور بغیر کسی ارمان و حسرت کے جان دی. میں گھبرایا اور بے اختیار بول اٹھا کہ:

" اجی حضرت! کچھ بولو تو سہی!"

وہاں کیا تھا، سانس بھی نہ تھی. اتنے میں لوگ ان کی تجہیز و تکفین کرنے لگے. میں نے کہا کہ:

"دو چار دن رہنے دو! مجھے سمجھ تو لینے دو کہ یہ کیا ماجرا ہے!"

لوگوں نے کہا:

"باؤلا ہوا ہے! کوئی مُردوں کو رکھتا بھی ہے؟ تمام کھال بکس جائیگی؛ گوشت گل پڑے گا؛ ہڈیوں کا ڈھانچا نکل آوے گا! کوّے اور چیلیں منڈلانے لگیں گی؛ ہڈیوں کے ڈھانچہ سے لوگ ڈر کر بھاگنے لگیں گے."

میں نے کہا کہ:

"دنیا کی حسرت لے جانے اور عبادت کے شوق میں مرجانے میں تو اب تک کچھ فرق نہیں دکھائی دیا ہے."

میں نہایت متردّد و متفکّر، حیران و ششدر، وہاں سے اٹھا اور دل بہلانے کے لئے اپنے باغ میں گیا، جو ایک بہت بڑا باغ تھا، اور جوانی اور ولولہ کے زمانہ میں مینے اس کو ازسرنو نہایت خوبصورت دخوشنما آراستہ کیا تھا، اور وہاں اکثر دوستوں کا اور بڑے بڑے نامی اور باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا. غالب کی دلکش و محبت آمیز بزرگانہ باتوں سے، آزردہ کی دلچسپ و دلربا فصاحت سے، شیفتہ کی متین و نیم خندہ زن وضع سے، صہبائی جاں نواز کے میخانۂ محبت سے، دل لشاد شاد رہتا تھا.

اِدھر اُدھر پھر رہا تھا. ایک چمن میں پہونچا جس کی نئی کھدائی ہوئی تھی. مٹی میں ایک ہڈی دکھائی دی، جس کو میں بکرے کی سری سمجھا. میں نے ٹھوکر مار کر پرے پھینک دیا. جب وہ باہر نکلی تو بکرے کی سری نہ تھی بلکہ آدمی کی کھوپری تھی. میں نے اپنے دل میں کہا کہ ایک دن اسی طرح کوئی شخص میری کھوپری کو بھی ٹھوکر ماریگا. میں نے دوڑ کر اُسے اٹھالیا، اور دیکھا کہ صرف ہڈیاں جوڑی رہ گئی ہیں؛ پیشانی کی ہڈی پر خط، خط میں شاید یہی نوشتۂ تقدیر ہو، پر پڑھی نہیں گئی؛ آنکھوں کی جگہ ایک گڑھا اور حلقہ تھا، انگلی ڈالو تو کچھ نہیں؛ ناک کی خوبصورتی بالکل نہ تھی، ایک شکستہ تھوڑی سی اونچی، نہایت بدنما ہڈی کا نشان تھا، اور اس کا سوراخ نہایت

ہی بُرا معلوم ہوتا تھا؛ دانت، جن کو موتی اور راولوں کی باڑ کہتے تھے، ایسے ہیبت ناک دکھائی دیتے تھے کہ دل کانپتا تھا۔

میں نے اپنی بے ادبی کی جو نادانستہ ہوئی معافی چاہی، اور پوچھا کہ:

"تم کون ہو؟ کیا مذہب تھا؟ عالم تھے؟ فقیہ تھے؟ دنیا کی حسرت میں مرے یا خدا کی عبادت میں؟"

ہر چند پوچھا، کچھ جواب نہیں ملا۔ پھر میں اس کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا کہ شاید کچھ نشان بھلائی یا بُرائی کا ملے؛ کچھ نہ ملا۔

ایک بڈھا باغبان میری ان سب باتوں کو دیکھ رہا تھا؛ کہنے لگا کہ:

"میاں کیا دیکھتے ہو؟ اچھے بُرے دل کا، گیدڑ بھیڑیئے کا، مرے پر سب کا ایک سا حال ہو جاتا ہے۔"

میں سخت متعجب ہوا، اور "جانسن" کی "سراب حیات" کو یاد کیا۔

میں نے کہا کہ یہ سب ہمارے خیالات ہیں کہ وہ شخص دنیا کی حسرت میں مرا، اور وہ شخص خدا کی عبادت میں مرے، یہ سب برابر ہیں۔ جو بات سچ ہے، وہ آپس کی ہمدردی، قومی اعانت، قومی بھلائی ہے۔ جبکہ ہماری قوم کا دنیا میں یہ حال ہے، کہ ذلت و خواری، نکبت و جہالت میں مبتلا ہے، تو اگر کوئی دنیا کی حسرت میں مر کر، جہنم میں گیا تو ہماری جوتی سے؛ اور عبادت کر کر بہشت میں گیا، تو ہماری بلا سے! ان کا کیا رونا ہے؟ جیتوں کو روؤ! جو مُردوں سے بھی بدتر ہیں!!

ہماری خدمات

وہ عید کا مبارک دن، یعنی یکم شوال ۱۲۸۰ھ نبوی اور ۱۲۸۷ھ ہجری، جبکہ ہمارا پہلا پرچہ نکلا، امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا نہ جاوے گا۔ ہماری قوم کی جو کچھ بداقبالی تھی وہ یہی تھی کہ کچھ نہ تھے، اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں۔ اس غفلت کے دارو ئے بیہوشی نے ان کے کانوں کو بہرا کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کو پتھرا دیا تھا۔ دل پتھر ہو گئے تھے۔ دماغ قابو میں نہیں رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سُست ہو گئے تھے۔ زندہ تھے، پر مُردوں سے بدتر تھے۔ اُٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے تھے، پر کچھ نہ کرتے تھے۔

اس تھوڑے عرصہ میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی: کچھ لوگ بخوبی ہوشیار ہو گئے! وہ سمجھے کہ ہماری کیا حالت ہے، اور ہم پر کیا مصیبت ہے، لبوں پہ جان ہے، پھر اگر جان نہیں، تو جان نہیں۔ کچھ لوگ ہوشیار ہوئے! پر ابھی آنکھیں ملتے ہیں، بہت سونے اور اندھیرے میں پڑے رہنے سے، آنکھوں میں چیپڑ جما ہوا ہے، کچھ کھلتی ہیں، مگر روشنی سے چندھیا جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ابھی تک نیند کے خمار میں ہیں؛ کچھ حرکت تو ان میں آئی ہے، مگر ابھی انگڑائی لے کر اور کروٹ بدل کر پھر غافل ہو جاتے ہیں! چُپ، پھر جھنجھوڑو تو:

"ہاں اچھا!"

کہہ کر دوسری کروٹ لیتے ہیں اور پھر غافل ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ابھی بدستور غافل پڑے سوتے ہیں! اور کچھ ایسے ہیں کہ ابھی ہوشیار ہوئے ہیں، مگر بدمزاجی اور تند خوئی سے ضد میں آکر کمل تانے پڑے ہیں، اور کہتے ہیں کہ:

"ہاں! ہم نہیں اُٹھنے کے، تمہارا کیا اجارہ ہے؟ ہم یوں ہی پڑے رہیں گے!"

بعضے ان میں سے اپنے پاس والوں کو کہتے ہیں کہ:

"تم بھی پڑے رہو، مت اُٹھو۔ سید احمد کون ہے جو جگاتا پھرتا ہے؟"

ہم اسی بات کو سن کر خوش ہوتے ہیں، اور دور ہی سے کھڑے کہتے ہیں کہ:

"وہ اُٹھے! وہ کُلبلائے!! خدا نے چاہا تو اب سمجھدار بھی ہو جاویں گے۔

یہی رست و خیز ہماری قوم کے اقبال کی نشانی ہے۔ پتھر پسیجا تو سہی، اب کسی نہ کسی طرف بہ نکلے گا۔ لوہا پگلا تو سہی، اب کچھ نہ کچھ ڈھل رہیگا۔ بند پانی سے بجز سڑ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ پانی کو بہنا چاہیئے، پھر کوئی نہ کوئی اپنا رستہ بنالے گا۔"

اس وقت ہماری ساری قوم میں اس بات کا غلغلہ ہے کہ ہماری حالت اچھی نہیں، قوم کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ کیا یہ صدا ان لوگوں کے دلوں میں جو قومی بھلائی چاہنے والے ہیں جان نہیں ڈال دیتی ہے؟ سولزیشن جس کے نام سے لوگوں کو نفرت تھی، کیا اب اس کا چرچا ہر گلی کوچہ میں نہیں ہے؟ کیا قومی ہمدردی کی کسی نہ کسی قدر تحریک اب ہر ایک کے دل میں نہیں ہے؟ کیا چاروانگ ہندوستان سے اخباروں میں "تہذیب! تہذیب!!"، "سولزیشن! سولزیشن!!"، "قومی ہمدردی! قومی ہمدردی!!" "پیٹریاٹزم! پیٹریاٹزم!!" کا غلغلہ نہیں ہے؟ کوئی اخبار اٹھاؤ، اس میں اُن میں سے کسی نہ کسی پر کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا آرٹیکل دیکھ لو۔ جس گلی کوچہ میں جاؤ، سید احمد کے "تہذیب الاخلاق" کا جھگڑا سُن لو۔ مکّہ میں جاؤ، تو سید احمد کو پاؤ۔ مدینہ میں جاؤ، تو 'سید احمد' کو پاؤ۔ بُرا کہو خواہ بھلا کہو، مگر ہم دعا گو ڈس کو مت بھولو:

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے! کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی!

یہ ولولہ اور غلغلہ، اور ہر ایک بات کا چرچا، دراصل ہماری قوم کی بھلائی کی نشانی ہے۔ اس پر ہم کو ذرا بھی خیال نہیں ہے کہ کسی کی کیا رائے ہے، اور کسی

کی کیا؟ کیونکہ جو بات ٹھیک نہیں ہے وہ آج نہیں، کل! کل نہیں، پرسوں سب کو معلوم ہو جاوے گی! اور سب اسی پر یقین کریں گے، اور اسی پر متفق ہوں گے۔ ضرور ایک دن وہ آوے گا، جو قوم کہے گی کہ:

"ہاں! سید بھی کوئی دیوانہ تھا۔ پر بات ٹھکانے کی کہتا تھا!"

اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہو، اور درحقیقت ہماری قوم میں ایسی تحریک آگئی ہو، تو ہمارے اس ناچیز پرچہ نے اپنا کام پورا کر لیا، اور اس کی مراد پوری ہو گئی۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

اصلی محبت اور سچی خیر خواہی قوم کی یہی ہے کہ اس کے نقصانوں کو دیکھے، اور ان کے مٹانے کی فکر کرے۔ جو لوگ نہایت ہمدردی اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے ہیں، ان کا دل اپنی قوم کی حالت پر، بہ نسبت اُن کے جو قوم کی طرفداری کرتے ہیں اور اس کے عیبوں کو چھپاتے ہیں، بہت زیادہ جلتا ہے۔ اور حقیقت میں وہی لوگ محبِّ وطن اور محبِّ قوم ہیں۔

جہاں تک ہم سے ہو سکا، ہم نے اردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی، الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیٔ عبارت سے، جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے، اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تُک بندی سے، جو اس زمانہ میں مقفّیٰ عبارت کہلاتی تھی، ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو! جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے! تاکہ دل سے نکلے، اور دل میں بیٹھے۔

ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی، اور ہمارے ہموطنوں نے اس کو کسقدر پسند کیا، مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی

آگئی ہے، اور اسکی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسند طریقہ ادائے مضمون کا بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی، روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے، جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل، عمدہ وسلیس عبارت میں، کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔

صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں ہے، جس سے ہماری معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں، ان کے ماخذ اور ان کے حالات، اور جو بحثیں کہ ان پر ہو چکی ہیں، اور جو امور ان کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں، ان سے آگاہی ہو۔ اور یہی سبب ہے کہ بعضی دفعہ ہماری قوم کے آرٹکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے؛ اور جن امور کا تصفیہ ہو چکا ہے، انہی کو پھر کہے جاتے ہیں۔

یہ نقص اسی وقت رفع ہوگا جبکہ انواع اقسام علوم و فنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاویں گی، اور ہماری قوم کو ان پر دسترس ہوگی۔ "سائنٹیفک سوسائٹی علی گڈھ" نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا؛ مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے، اور اسی سبب سے اس کا کام ادھورا پڑا ہے۔

نئی اندونے در حقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے۔ تیر و درد و ظفر نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو، کی ہو؛ میر امن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہدی ہو، کہدی ہو؛ وہ اس سے زیادہ فصیح و دلچسپ و با محاورہ نہ ہوگی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کو سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے، جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی۔ یہ اسی زمانہ میں پیدا ہوئی، اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی، اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی، جو اب حد سے زیادہ اجیرن ہو گئے ہیں، تو چند روز میں ہماری

کی تحریریں بھی "میکالے" اور "اڈیسن" کی سی ہو جاویں گی۔

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانہ میں اردو لکھتے ہیں، وہ انگریزی لفظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں۔ مگر ان کو غور کرنا چاہیئے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے ہیں؛ اور جب کوئی زبان محدود ہو جاتی ہے، مردہ کہلاتی ہے۔ غیر زبان کے الفاظ کو اپنا کر لینا اہلِ زبان کا کام ہے؛ مگر ان کا ملا لینا آسان کام نہیں۔ اہلِ زبان غیر زبان کے لفظ کو ایسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں، جیسے تاج گنج کے روضہ میں سنگ مرمر پر عقیق و یاقوت و زمرد کی پچیکاری ہے۔ بے شک وہ دوسرا پتھر ہے، مگر ایسا وصل ہوا ہے، کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا، اسی میں سے پیدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اہلِ زبان کے سوا، دوسرے سے نہیں ہو سکتی؛ اور نہ سب اہلِ زبان سے، بلکہ صرف اُس سے جسے خدا نے ایسا ملکہ دیا ہو۔

یہ بات بھی غور کرنی چاہیئے کہ اہلِ زبان کو دوسری زبان کے لفظوں کے لے لینے کی کیوں ضرورت پڑتی ہے؟ اس کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ ایک مورخ جو کسی ملک کی تاریخ لکھتا ہے، اس کو ضرور ہوتا ہے کہ اس ملک کے تاریخی الفاظ، یعنی جو تاریخ سے متعلق ہیں، اور ملکوں کی تقسیم اور مناصب، اسی ملک کی زبان میں قائم رکھے کیونکہ اگر ان کے لئے اپنی زبان کے الفاظ اور اصطلاح بدل دے، تو وہ تاریخ نہایت نکمی اور غیر مفید ہو جاوے گی۔

قرآن مجید کو پڑھو، اور دیکھو! اس میں کس قدر الفاظ دوسری زبانوں کے داخل ہیں۔ اگر عربی زبان کے علم ادب اور علوم و فنون میں الفاظ جدیدہ شامل ہونے بند ہو جاتے، تو وہ زبان بھی مثل عبرانی، و سنسکرت، و ژند کے مردہ زبان ہو جاتی۔

علوم و فنون پر کتابیں لکھنے والا بعض دفعہ مجبور ہوتا ہے کہ جس زبان سے اس علم کو لیا ہے، اسی زبان کے بعض الفاظ اور مصطلحات بدستور قائم رکھے۔ دیکھو! یونانی زبان سے جو علم طب عربی میں ترجمہ ہوا، کس قدر یونانی الفاظ اس میں شامل ہیں

اگر کسی کو "ریشر غش" نہ ہو تو ضرور اس کو تسلیم کرے گا۔

عربی زبان سے کمسٹری انگریزی میں گئی۔ آج تک بہت سے عربی لفظ انگریزی زبان کی کمسٹری میں شامل ہیں۔ پوچھو! کہ اس مقام پر میں نے کیوں لفظ کمسٹری بولا؟ اور کیمیا کا لفظ، جس سے خود انگریزوں نے لفظ کمسٹری بنایا ہے، کیوں نہ بولا؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم لوگوں میں کیمیا کے لفظ کے ساتھ چاندی سونا بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہے، جو محض ایک غلط خیال ہے۔ اب وہ شخص جو اپنی قوم کی ہمدردی رکھتا ہے اور ان غلط خیالات کو مٹانا چاہتا ہے، کسی جگہ کمسٹری اور کسی جگہ کیمیا کا لفظ بول جاتا ہے، تاکہ کمسٹری کا لفظ اس غلط خیال کو نہ آنے دے، اور کیمیا کا لفظ کمسٹری اور کیمیا کے ایک ہونے کا خیال پیدا کرے۔

لٹریچر، یعنی علم ادب، زبان کے لئے نہایت وسیع جولانگاہ۔ اس میں وہ اپنی طبیعت کا زور دکھلاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے وہ اپنے دل کی بات دوسرے کے دل میں ڈالتا ہے۔ اپنی شستہ تقریر، اور مناسب مناسب الفاظ سے لوگوں کے دلوں کو جس بات پر چاہتا ہے، ابھارتا ہے۔ انہی لفظوں سے کبھی ہنسا دیتا ہے، اور کبھی رلا دیتا ہے۔ پرانے دقیانوسی خیالوں کو مٹاتا ہے، اور نئے نئے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے۔ کبھی واحد کے بدلے جمع، اور جمع کے بدلے واحد، کے صیغے بولتا ہے۔ کبھی حاضر کو غائب، اور غائب کو حاضر کہہ دیتا ہے۔ کبھی ترکیب جملے کی دوسری زبان کی ترکیب پر گھڑ دیتا ہے، اور اس سب میں ایک لطف اور ایک قسم کا مزا رکھتا جاتا ہے۔

اگر وہی چال وہ چلے جو اہل زبان نہیں ہے، تو سیکڑوں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل زبان جو کہے سو صحیح ہے، اور غیر اہل زبان وہ چال چلے تو غلط ہے۔ نہیں! درحقیقت اس کا کہنا صحیح اور اس کا بولنا غلط ہوتا ہے، اور اہل زبان ہی اس میں تمیز کر سکتا ہے۔

دوسری زبان کے لفظوں کا اپنی زبان میں بولنا کبھی عبارت کا لطف بڑھانے کے لئے ہوتا ہے؛ کبھی اپنی زبان کو وسعت دینا، اور نئے لفظوں کو اس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے؛ کبھی سامعین کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے لئے بولا جاتا ہے!

کبھی اس مطلب کی عظمت جتانے کو کہا جاتا ہے، جو عظمت اس مرادف لفظ سے جو اس زبان میں مستعمل ہے نہیں ٹپکتی: مثلاً، بعضے اہلِ زبان اپنی تحریر و تقریر میں مناسب موقع پر، جس کی مناسبت کو اہلِ زبان ہی جان سکتے ہیں، "جنٹلمین" کا لفظ بولتے ہیں۔ اگر وہ اس جگہ "شریف" یا "شریفوں" کا لفظ بولیں، تو اس لفظ یا مطلب کی عظمت خاک میں مل جاتی ہے؛ اس لئے کہ ہماری زبان، اور عام استعمال میں لفظ "شریف" ذلیل ہو گیا ہے، اس سے بجز اس خیال کے کہ اس کی حسب نسب میں کچھ نقصان نہیں ہے؛ شیخ، سید، مغل، پٹھان ہے، اور کوئی خیال پیدا نہیں ہوتا۔ مگر اس لفظ کا بولنے والا اس خیال سے زیادہ تر وسیع اور اعلیٰ خیال دل میں بٹھانا چاہتا ہے۔ وہ اس لفظ سے ایسا شخص بتانا چاہتا ہے جو رذیل آدمیوں کی بہ نسبت خاندان میں، تعلیم میں، حیثیت میں، اطوار میں افضل ہو۔ اگرچہ شریف کے بھی یہی معنی ہونے چاہئیں، مگر چونکہ اس کا استعمال ایک خاص بات پر ہو گیا ہے، تو یہ پورا پورا خیال اس لفظ سے دل میں نہیں آتا۔

یہی حال اس قسم کے اور لفظوں کا ہے۔ اگر ہم ان سب کی تفصیل لکھیں تو ہمارا یہ آرٹیکل لغت یا اصطلاحات کی ایک کتاب ہو جاوے۔ اس نمونہ سے ہمارے ہموطن خیال کر سکیں گے کہ ہماری قوم کو اپنی زبان کی نسبت بھی کیا کیا کرنا ہے۔

ہماری زبان کے علم و ادب میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں، اور مدحیہ قصیدوں، اور ہجر کے قطعوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہیئے تھا۔ نہیں! وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں؛ اور جودتِ طبع، اور تلاش مضمون کے لئے نہایت مفید ہیں۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھے! دوسری قسم کے مضامین، جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں، اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں، نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذاتِ شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہیں تھا، اور

اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔ مگر نہایت خوشی کا مقام ہے زمانہ نے اس کو بھی رفارم کیا، ہم نے جو بہت ہائے پکار کی، تو اب شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی؛ اور اہلِ پنجاب اس نقص کے رفع کرنے پر متوجہ ہوئے۔

اردو زبان کے علم ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن، جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ قائم ہوا، ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ہماری قوم کے لائق و فائق لوگوں نے اس پر بخوبی توجہ کی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد، پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور، نے اس مشاعرہ کے بقاءِ قیام میں سب سے زیادہ ہمت مصروف کی ہے۔ ان کی طبیعت کے زور، اور پاکیزگی مضامین، اور شوکتِ الفاظ، اور طرزِ ادا، سے ہم لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی مثنوی "خوابِ امن" جو "آفتابِ پنجاب" میں چھپی، ہمارے دلوں کو خوابِ غفلت سے جگاتی ہے۔ مولوی خواجہ الطاف حسین حالی، اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر محکمہ ڈائرکٹر پنجاب، کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی "حبُّ الوطن" اور مثنوی "مناظرۂ رحم و انصاف"، جو "پنجابی اخبار" میں چھپی ہیں، درحقیقت ہمارے زمانہ کے علمِ ادب میں ایک کارنامہ ہیں۔ ان کی سادگیٔ الفاظ، صفائیٔ بیان، عمدگیٔ خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آبِ زلال سے زیادہ خوشگوار ہیں! بیان میں، زبان میں، آمد میں، الفاظ کی ترکیب میں، سادگی و صفائی میں، کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں!

ہاں! یہ بات سچ ہے کہ ہمارے ان باعثِ افتخار شاعروں کو ابھی نیچر کے میدان میں پہونچنے کے لئے آگے قدم اٹھانا ہے، اور اپنے اشعار کو نیچرل پوئٹری کے ہمسر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے۔ مگر ان مثنویوں کے دیکھنے سے اتنا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے! اور اس کا بھی تصور ہو سکتا ہے کہ اگر ہماری قوم متوجہ ہے، اور "مضامین عشقیہ اور مضامین خیالیہ" اور "مضامین بیان واقع اور مضامین نیچر" میں جو تفرقہ ہے، اُس کو دل میں بٹھالے، تو ان بزرگوں کے سبب ہماری قوم کی لٹریچر

کیسی عمدہ ہو جاوے گی! اور ضرور وہ دن آوے گا کہ ہم اپنی قوم کے کسی نہ کسی پر ایسا ہی فخر کریں گے، جیسے کہ یورپ کے لوگ "ملٹن" اور "شیکسپیئر" پر ناز کرتے ہیں۔

مضامین بیان واقع اور مضامین نیچر ایسے پاس پاس ہیں کہ اُن میں دھوکا پڑ جاتا ہے! مگر درحقیقت پہلا دوسرے سے بالکل علیحدہ ہے۔ پہلا تو ایک بیرونی حالت ہے، اور دوسرا اندرونی۔ اسی پچھلے میں وہ طاقت ہے جو دل میں اثر کرتی ہے۔ ابھی تک ہماری قوم کا کلام بیرونی حالت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ مگر ہم کو امید ہے کہ بہت جلد وہ اندرونی حالت تک بھی پہونچ جاوے گا۔

ہمارے کاموں کی بہ نسبت، ہماری ذات اور ذاتی خیالات سے لوگوں نے بہت بحث کی! لیکن اب وہ بھی بہت ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ بہت لوگ سوائے چند متعصبین کے سمجھ گئے ہیں کہ ہم اسلام کی اور مسلمانوں کی کیسی خیرخواہی کرتے ہیں۔ آفتاب اسلام کو جس کی شعاعیں گرد وغبار کے سبب دھوندلی ہو گئی ہیں، اور جس کی کرنیں، ہم تک نہیں پہونچتیں، کس طرح چمکتا ہوا اور روشن کرنا چاہتے ہیں۔ اصلی سرچشمہ حیاتِ جاودانی کو جو بہت سے نالے ندیوں کے مل جانے سے گدلا اور میلا ہو گیا ہے، کس طرح پاک وصاف کرنا چاہتے ہیں۔

ہماری خواہش ہے کہ اسلام، جس کا مزا صرف لوگوں کی زبان پر رہ گیا ہے اور حلق سے نیچے نہیں اُترتا، اس کا اثر دل تک پہونچایا جاوے۔ ہماری آرزو ہے کہ اسلام، جس کو ہم سب سے زیادہ عزیز اور سب سے عمدہ سمجھتے ہیں، اس کا اثر مسلمانوں کے دلوں میں، ان کے اخلاق میں، ان کے چال چلن میں، ان کے معاملات میں، ان کے برتاؤ میں سب میں پایا جاوے۔ اسلام کو صرف زبان ہی سے نیک نہ کہا جاوے، بلکہ مسلمانوں کو اس نیکی کا نمونہ بنا کر دکھایا جاوے۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی حاجی کہلانے کے لئے حاجی بنے! بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ حج کا جو اثر دل میں ہونا چاہیئے، اس کو حاصل کرے۔ اندھے والا حاجی بننے سے تو اسلام کی کچھ عزت نہیں ہو سکتی! ان کے لئے تو یہی کہنا بس ہے کہ:

رحمت بر اخلاقِ حجّاج باد!

نماز سے اگر صرف ماتھے پر گٹا ڈال لینا مقصود ہے، تو وہ تو پوری رِدیاہی ہے۔ نماز سے نیاز پیدا کرنا چاہیئے! دل پر اس کا اثر پڑھانا چاہیئے! اگر طہارت کو صرف ہاتھ پاؤں دھونے پر منحصر سمجھا، تو اسلام کی کچھ پیروی نہیں کی۔ ظاہری طہارت تو باطنی طہارت کا اشارہ کرتی ہے۔ پھر، اگر باطنی طہارت حاصل نہیں ہوئی، تو یہ ظاہری طہارت نجاست سے بدتر ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسلام کے جو روحانی نتیجے ہیں وہ مسلمانوں کو حاصل ہوں۔ واللہ مُتمُّ نورِہٖ وَلَو کَرِہَ الکافِرُون ط

رخصت

سوتوں کو جھنجھوڑتے ہیں تاکہ جاگ اٹھیں۔ اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہو گیا! اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے اور کچھ جھنجھلائے "ادھر ہاتھ جھٹک دیا، اُدھر پیر پٹک دیا، اور جھنجلاہٹ میں اینڈے پڑے رہے، تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہے۔ اگر یہ خیال ٹھیک ہو، تو ہم کو بھی زیادہ چھیڑنا نہ چاہیئے، اور "تہذیب الاخلاق" کو بند کر کر، دور سے نیند کے ان خمار آلودوں کا، جو اب صرف جھنجلاہٹ سے اینڈے پڑے ہیں، اٹھنا اور ہوشیار ہونا دیکھنا چاہیئے۔

بچے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ:

"ہم کو اٹھائے جاؤ گے، تو ہم اور پڑے رہیں گے۔ تم ٹھہر جاؤ! ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

بچہ کڑوی دوا پیتے وقت بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ:

"بی! یہ مت کہے جاؤ کہ 'شاباش بیٹا پی لے! پی لے!!' تم چپ ہو رہو، میں آپ ہی پی لوں گا۔

لو بھائیو! اب ہم بھی نہیں کہتے کہ:

"اٹھو! اٹھو!! پی لو! پی لو!!"

اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنے کو ناصح مشفق سمجھتا ہوں، اور جو حالت قوم کی ہے، اس کو جتلانا چاہتا ہوں۔ ایک دن تھا کہ ہم بھی اسی رنگ میں تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھانے سے نہ اٹھتے تھے۔ اب ہماری یہ مثل ہے:

لو آج تیر مسجدِ جامع کے ہیں امام،
داغِ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا!

کیا کیا خیالات ہماری قوم میں ہیں جو ہم میں نہ تھے! اور کیسی کیسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر نہ تھیں۔ جب رند تھے، تو فرہاد سے بڑھ کر تھے! جب زاہدِ خشک تھے، تو نہایت ہی اکھڑ تھے! جب صوفی تھے، تو رومی سے برتر تھے۔ اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غمخوار۔ تم کو کس نے جگایا؟ دل اور زمانہ نے۔ دل کی گھڑت ایسی تھی، جس میں ہمیشہ غمخواری کی تھی پر سوتا تھا۔ زمانہ نے جھٹکا دیا اور جگا دیا۔

دفعتہً دیکھا کہ دنیا الٹ گئی، اور رنگ برنگ کی پھلواڑی سب اجڑ گئی! قوم کی حالت وہ دیکھی کہ خدا کسی کو نہ دکھلائے۔ اس بربادی کے سبب کا غیر قوم کو تو اور ہی خیال ہوا، پر غلط ہوا! اور مجھ کو جو ہوا، وہ خود اپنی قوم کی حالت کا ابتر ہونا تھا۔ قوم، کیا دنیا کی باتوں میں، اور کیا دین کے کاموں میں، ایسے تاریک گڑھے میں پڑی تھی کہ ادھر ادھر کی چیزیں تو درکنار، وہ اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی، جس میں پڑی تھی! پھر میرا دل آخر دل ہی تھا؛ پتھر نہ تھا جو نہ پگھلتا اور اپنی قوم کی حالت پر غم نہ کرتا!

ایک مدت تک اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا کیجئے؟ جو خیالی تدبیریں کرتا تھا، کوئی بن پڑتی نہ معلوم ہوتی تھیں۔ جتنی امیدیں کرتا تھا، سب ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھیں۔ آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کرنا بہتر ہے۔ کرو! جو کچھ کر سکو، ہو یا نہ ہو۔ اسی بات پر دل ٹھہرا، ہمت نے ساتھ دیا، اور صبر نے سہارا، اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔ اس میں خدا کی طرف کا بدلہ تو نہ جب معلوم تھا اور نہ اب معلوم ہے! مگر قوم کی طرف کا بدلہ اسی وقت سے معلوم تھا جو اب ظاہر ہے: کافر، مرتد، ملحد، زندیق، اسلام کا دشمن، مسلمانوں کا ہاجی، قوم کا عیب جو، دین دنیا سے آزاد، کہنا اور نام پر دو چار صلواتیں سنا دینا۔ مگر شکر ہے کہ ان کی کسی بات نے ہمارا دل نہیں دکھایا۔ اور ہمیشہ ہمارے دل میں یہی رہا کہ:

"اے خدا! ان پر رحم کر، کیونکہ وہ نہیں جانتے۔"

ان ہی قومی بھلائی کے ولولوں میں سے تہذیب الاخلاق کا نکالنا بھی ایک ولولہ تھا، جس کا اصلی مقصود قوم کو اس کی دینی اور دنیاوی ابتر حالت کا جتلانا اور سوتوں کو جگانا، بلکہ مُردوں کو اُٹھانا، اور بند سڑے ہوئے پانی میں تحریک پیدا کرنا تھا۔ یقین تھا کہ سڑے ہوئے پانی کو ہلانے سے بو زیادہ پھیلے گی؛ مگر حرکت میں آجانے سے پھر خوشگوار ہو جانے کی توقع ہوتی تھی۔ پس کیا ہم نے جو کچھ کرنا تھا، اور پایا ہم نے جو کچھ کہ پانا تھا! خدا سے آرزو ہے کہ اگر ہم نے وہ نہیں کیا جو ہم کو کرنا تھا، تو وہ وہی کرے جو اس کو کرنا ہے:

از بندہ خضوع والتجا مے زیبد! بخشایش بندہ از خدا مے زیبد۔
گر من کنم آنکہ، آں مرا نا زیباست؛ تو کُن ہمہ آنکہ، آں ترا مے زیبد۔

ہم نے بذریعہ اپنے اس پرچہ کے اپنی قوم کی خدمت کی۔ مذہبی بے جا جوش سے جس تاریک گڑھے میں وہ چلی جاتی تھی، اس سے خبردار کیا۔ دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ مبتلا تھی، اس میں ان کو روشنی دکھلائی۔ مذہب اسلام پر نادانی سے جس قدر گھٹائیں چھا رہی تھیں، ان کو ہٹایا، اور اس کے اصلی نور کو جہاں تک ہم سے ہو سکا چمکایا۔ اردو زبان کا علم ادب، جو بد خیالات، اور موٹے دبھتے الفاظ کا مجمع ہو رہا ہے، اس میں بھی جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اصلاح چاہی۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اس میں کچھ کیا؛ مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں، ان باتوں میں بقدر اپنی طاقت کے کوشش کی۔ قومی ہمدردی، قومی عزت، سلف آنر یعنی اپنے آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہیں کیا، تو ان لفظوں کو تو ضرور اردو زبان کے علم ادب میں داخل کیا۔

ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو؛ مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا؛ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اردو زبان کے علم ادب کا ترقی پانا، یہی ہماری مرادیں تھیں، جن کو ہم نے بھر پایا۔ اب بہت لوگ ہیں جو ان باتوں کو پکارتے ہیں۔ گو اس وقت اُلٹی مہٹی لہریں کھاتے ہیں، مگر پانی میں حرکت ہی کا آجانا کافی ہے۔ پھر وہ خود ہی پنسال میں آپ چورس ہو رہے گا۔ اس لئے

مناسب ہے کہ ہم بس کریں اور پانی کو آپ ہی آپ چورس ہونے دیں ۔

ہمارے دوست ہماری اس خاموشی کا کوئی سبب دوساز کارنہ خیال کرینگے! بلکہ یہ خیال کریں گے کہ ہم کسی دوسری قومی بھلائی کے کام میں معروف ہوں گے ، جو اس سے بھی زیادہ قوم کو مفید ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے :

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ

اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے بہت سے ایسے دوست ہیں ، جو اس پرچہ کے بند ہونے سے نہایت ہی شکستہ خاطر ہوں گے ! مگر ہم ان سے معذرت کرتے ہیں ، اور اب اس پرچہ کو ان سے رخصت کرتے ہیں۔ اور وہ دن بھی اب آنے والا ہے کہ ہم خود بھی ان سے رخصت ہوں گے ! وَالسَّلام ! !

اگر خوشی کی کھوج میں ہم کو ملے ہیں غم
کانٹوں سے زخم کھائے ہیں پھولوں کی چاہ میں
(ارشاد محمود [illegible])

محمد عبداللہ خاں خویشگی کی مرتّبہ کردہ دیگر کتابیں

فرہنگ عامرہ اردو زبان کی لغت ہے جو جدید طرز پر مرتب ہوئی ہے۔ یہ کتاب ۶۶۰ صفحات پر مشتمل مجلد اور خوشنما گرد پوش سے مزیّن ہے۔ قیمت چھ روپیہ ہے۔ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

الفاظ کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے اس طرح رکھی گئی ہے کہ کسی لفظ کی جستجو میں دقت نہیں ہوتی۔

صحت تلفظ کے لئے ہر لفظ کے آگے اس کے ٹکڑے کر دئے گئے ہیں اور ہر ٹکڑے پر اعراب دیدئے گئے ہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جو انگریزی زبان کی لغات میں رائج ہے۔

فارسی الفاظ کی خلاف قیاس اور عربی الفاظ کی مستعمل جمع اپنے صیغۂ مفرد کے ذیل میں درج کر دی گئی ہیں، اور کثیر الاستعمال صیغہائے جمع کو مستقل لغت کی حیثیت سے اپنی جگہ پر پھر دوبارہ دے دیا گیا ہے۔

کثیر الاستعمال فارسی مصادر کے مضارعات اور سماعی و قیاسی مشتقات بھی دئے گئے ہیں، اور اسی کے ساتھ قلیل الاستعمال مصادر کی بھی بڑی تعداد شامل کر دی گئی ہے۔

فارسی زبان کے املے میں اکثر حروف دوسرے حروف سے بدل جاتے ہیں، اسکی صراحت بھی ہر حرف کی تقطیع کی ابتدا میں کر دی گئی ہے۔

دورِ حاضرہ کے بہت سے مفید معربات اور مفرسات اس میں شامل ہیں۔

مخرب اخلاق استعارات اور محرک جذبات شرح تشبیہات سے تا بمقدور اجتناب کیا گیا ہے۔

اسمائے اشیاء کے معانی میں جدید ترین تحقیقات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

مندرجہ بالا خصوصیات کے ماسوئی بھی فرہنگ ہذا کی ترتیب میں مفید اور نادرہ کار اصلاحات کی گئی ہیں جن کی وضاحت یہاں طوالت کا موجب ہو گی۔ پشت پر نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

متقلب (مُتَقَل۔لِب) پھرنے والا، الٹنے والا
متقن متقنہ (مُت۔قَن، مُت۔قَنَہ) مضبوط، محکم
متکا (مُت۔تَکا) تکیہ گاہ، سہارا
متکاثف (مُتَکا۔ثِف) گاڑھا، دبیز، دلدار
متکبر (مُتَکَب۔بِر) گھمنڈی، مغرور
متکبرانہ (مُتَکَب۔بِرا۔نَہ) متکبر سے منسوب
متکسر (مُتَکَس۔سِر) ٹوٹنے والا، شکستہ ہونے والا
متکفل (مُتَکَف۔فِل) ضامن، کفیل
متکلف (مُتَکَل۔لِف) تکلف کرنے والا
(مُتَکَل۔لَف) تکلف کیا ہوا
متکلم (مُتَکَل۔لِم) کلام کرنیوالا، بولنے والا، علم کلام جاننے والا جمع متکلمین (مُتَکَل۔لَم) کلام کیا ہوا
متکون (مُتَکَو۔وِن) ہست ہونیوالا، موجود ہونیوالا
متکی (مُت۔تَکِی) بھروسہ کرنے والا، تکیہ کرنے والا
(مُت۔تَکا) تکیہ کیا ہوا، تکیہ گاہ، سہارا
متلاشی (مُتَلا۔شِی) پریشان، خراب، معدوم
متلاطم (مُتَلا۔طِم) تھپیڑا مارنے والا، موجزن
متلالی (مُتَلا۔لِی) تاباں، روشن
متلبس (مُتَلَب۔بِس) لباس پہننے والا، چھپنے والا
متلذذ (مُتَلَذ۔ذِذ) لذت اٹھانے والا
(مُتَلَذ۔ذَذ) لذت اٹھایا ہوا
متلطخ (مُتَلَط۔طَخ) آلودہ، لتھڑا ہوا
(مُتَلَط۔طِخ) لتھڑنے والا
متلطف (مُتَلَط۔طِف) مہربانی کرنے والا
(مُتَلَط۔طَف) مہربانی کیا ہوا
متلف (مُت۔لِف) نیست کرنیوالا، تلف کرنیوالا
(مُت۔لَف) تلف کیا ہوا، نیست کیا ہوا
متلقی (مُتَلَق۔قِی) ملاقات کرنے والا
(مُتَلَق۔قا) ملاقات کیا ہوا
متلون (مُتَلَو۔وِن) غیر مستقل مزاج، رنگ برنگ ہونیوالا
متلہف (مُتَلَہ۔ہِف) اندوہگیں، افسوس کرنیوالا

متمادی (مُتَما۔دِی) دراز، لمبا، انتہا کو پہونچنے والا۔
متماثل (مُتَما۔ثِل) باہم مشابہ، مانند ہونیوالا
متمائل (مُتَما۔ئِل) میل و خواہش کرنیوالا، جھکنے والا
متمتع (مُتَمَت۔تِع) نفع پانے والا
متمثل (مُتَمَث۔ثِل) ہم مثل
متمدن (مُتَمَد۔دِن) مہذب، بسنے والا
متمرد (مُتَمَر۔رِد) سرکش، نافرمان
متمزق (مُتَمَز۔زِق) ٹکڑے ہونے والا
متمشی (مُتَمَش۔شِی) جاری و رواں ہونے والا
(مُتَمَش۔شا) جاری کیا ہوا
متمکن (مُتَمَک۔کِن) جگہ پکڑنے والا
(مُتَمَک۔کَن) جگہ پکڑا ہوا
متملق (مُتَمَل۔لِق) چاپلوس، خوشامدی
(مُتَمَل۔لَق) تملق کیا ہوا
متمم (مُتَمَم۔مِم) تمام کرنے والا، کامل کرنے والا
(مُتَمَم۔مَم) تمام کیا ہوا، کامل کیا ہوا
متمنی (مُتَمَن۔نِی) آرزومند، تمنا کرنے والا
(مُتَمَن۔نا) آرزو کیا ہوا، تمنا کیا ہوا
متموج (مُتَمَو۔وِج) موجزن، لہریں مارنیوالا
متمول (مُتَمَو۔وِل) دولتمند، مالدار
متمیز (مُتَمَی۔یِز) الگ ہونیوالا (مُتَمَی۔یَز) الگ
متن (مَت۔ن) کتاب کے صفحہ کی درمیانی عبارت
جمع مُتُون، مِتان
متناسب (مُتَنا۔سِب) تناسب رکھنے والا
متنافی (مُتَنا۔فِی) ایک دوسرے کو فنا کرنے والا
متناقض (مُتَنا۔قِض) ایک دوسرے کی ضد ہونیوالا
متناکح (مُتَنا۔کِح) باہم نکاح کرنے والا
متناوحہ (مُتَنا۔وِحَہ) چوبائی، چاروں طرف کی ہوا
متناہی (مُتَنا۔ہِی) انتہا کو پہونچنے والا
متنبہ (مُتَنَب۔بِہ) واقف، آگاہ، خبردار
متنبی (مُتَنَب۔بِی) جو نبی نہ ہو مگر بنتا ہو

بھارت و پاکستان کے [illegible] ماہرین

پروفیسروں اور استادوں، نیز گرانپایہ معیاری رسالوں اور شہرۂ آفاق اخباروں نے اس جدید انداز کی لغت کو بہت زیادہ پسند کیا ہے، ان بے شمار رایوں میں سے کچھ یک سطری خلاصے آپ کے ملاحظے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔

ارباب علم و قلم

پنڈت جواہر لال نہرو کے جنرل سکرٹری دوارکا ناتھ کچرو نے ارقام فرمایا:

یہ لغت پنڈت جی کے لئے یقینی مفید اور جاذب توجہ ہوگی۔ (ترجمہ)

سردار عبد الرب نشتر: آپ کی کوشش قابلِ داد ہے، خدا کرے کہ آپ زیادہ سے زیادہ اردو زبان کی خدمت کر سکیں۔

مسٹر آصف علی: آپ نے ایک بڑی مہم سر کی ہے اور جس محنت سے آپ نے یہ کام سرانجام دیا ہے، وہ مبارک باد کی مستحق ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں: آپ نے جس محنت اور قابلیت سے یہ مفید لغت مرتب فرمائی ہے، اس پر اردو زبان کا ہر قدردان خراج تحسین پیش کریگا۔ زبان کے اساتذہ اور طلبہ سب اس سے مستفید ہونگے۔

خواجہ غلام السیدین: آپ نے اس فرہنگ کو بہت محنت اور قابلیت سے مرتب کی ہے۔

نواب مہدی یار جنگ سابق وزیر تعلیمات حیدر آباد: مجھے یقین ہے کہ اس کی تمام ملک میں بہت مانگ ہوگی۔ آپنے اسے مرتب کر کے ملک کی اچھی خدمت کی ہے۔

مسٹر بشیر حسین زیدی سابق وزیر اعظم رامپور: فرہنگ عامرہ جیسا خوش اسلوب لغت مرتب فرما کر آپ نے ملک کے لئے لائق ستائش خدمت انجام دی ہے۔

سر تیج بہادر سپرو سابق صدر انجمن ترقی اردو: ہم سب کو جن کو اردو سے تعلق ہے آپ کا احسان ماننا پڑے گا۔ یہ لغت نہایت قابل قدر ہے۔

قاضی عبد الغفار سکرٹری انجمن ترقی اردو: اردو زبان کے کسی حامی اور کسی تعلیمی ادارہ کا کتاب خانہ اس سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔

•

مولٰنا حسین احمد مدنی: تعلیم و تعلم کے سلسلہ میں یہ کتاب آبِ حیات کا کام دے گی۔
مولٰنا طیب قاسمی: یہ کتاب بہ حیثیت مجموعی اردو ادب کی ایک بے نظیر خدمت ہے۔
مفتی کفایت اللہ: اس قسم کی سہل الماخذ مفید اور کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔
علامہ تاجور نجیب آبادی: اکثر اساتذہ فرہنگ عامرہ سے مستفید ہو رہے ہیں، انہیں سے ایک میں بھی ہوں
علامہ نیاز فتحپوری: میں نے اس فرہنگ کو دیکھا ہے اور یہ تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں۔
مولٰنا حسرت موہانی: اس لغت کا پرجوش خیر مقدم کیا جائے گا۔
خواجہ حسن نظامی: یہ فرہنگ ہر لحاظ سے بے مثل ہے۔
خان بہادر عبد الرحمٰن چغتائی لاہور: سب سے پہلے آپ کی تصنیف فرہنگ عامرہ بینے ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد دکن سے خریدی اور اسوقت سے آج تک ہر جگہ جہاں موقع ملا اس کی تعریف کرتا رہا۔
نواب سائل دہلوی مرحوم: فرہنگ عامرہ کو شائقین ادب اردو نعمتِ غیر مترقبہ جانیں گے اور اس کے مطالعہ سے عام و خاص فوائد کثیر حاصل کریں گے۔
حامد علیخاں نائب مدیر رسالہ ہمایوں: آپ نے بڑی محنت کی ہے اور ایک مفید کام سر انجام دیا ہے۔
مولوی احمد بخش مدیر جنرل نیوز دہلی: جس کتاب خانہ میں فرہنگ عامرہ نہیں ہے اُسے علمی اعتبار سے مفلس سمجھنا چاہیئے۔
سید سجاد حیدر یلدرم سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ: یہ فرہنگ مغربی ڈکشنریوں کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ الفاظ کے معنی مختصر مگر صحیح اور تشفی بخش دیئے گئے ہیں۔
مولوی منظر اللہ سابق اسسٹنٹ رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد: یہ بڑی مفید کتاب ہے اور جدید طرز پر مرتب ہوئی ہے۔
پروفیسر احسن مارہروی مرحوم: مؤلف موصوف نے یہ علمی فرض کفائی پوری کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے۔ طلبہ غلطی کریں گے، اگر ایسے کار آمد لغت سے کام نہ لیں گے۔ اس کا مطالعہ یقیناً ان کو دوسرے لغتوں سے مستغنی کردے گا اور امتحان کے وقت باسانی کامیابی کا اطمینان دلائے گا۔
پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ: قابل مؤلف نے بڑی محنت و تحقیق سے کام لیا ہے۔ مجھے

امید ہے کہ اس فرہنگ کی پذیرائی اردو داں طبقہ میں نہایت فراخ حوصلگی سے ہوگی۔

پروفیسر الیاس برنی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد: امید ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول ہوگی۔ مدت سے اردو میں ایسے جامع اور مختصر فرہنگ کی ضرورت تھی۔

پروفیسر احتشام حسین رضوی لکھنؤ یونیورسٹی: میں فرہنگ عامرہ کو استعمال کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگ اسے استعمال کر رہے ہیں۔

پروفیسر مہیش پرشاد ہندو یونیورسٹی بنارس: آنجناب کی گرانمایہ تصنیف فرہنگ عامرہ دیکھ چکا ہوں۔ کتاب نہایت ہی عمدہ ہے۔

پروفیسر حامد اللہ افسر میرٹھی: فرہنگ عامرہ ہر تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔ آپ کی محنت اور تحقیق و تدقیق کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ تقریباً چالیس ہزار الفاظ کا ایک مختصر سے حجم میں جمع کر دینا، معانی کی تفہیم میں اختصار اور وضاحت کا خیال رکھنا، تلفظ کی توضیح جدید مغربی زبانوں کے طرز پر ہر لفظ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کرنا، اسقدر دشوار کام تھا کہ علماء کی ایک جماعت سے بھی اس کا بخیر و خوبی انجام کو پہونچنا مشکل تھا، اس کا صلہ آپ کو حکومت سے ملنا چاہیئے۔ حامیانِ اردو عزیب ہیں۔

علمی و ادبی رسالے

شاعر آگرہ: ہندوستان کے کسی ادیب و شاعر، رسالہ و اخبار نے اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا ہے۔ یہ مفید ترین لغت اپنے اندر بے شمار خوبیاں رکھتا ہے۔

جامعہ دہلی: ادائے تلفظ کا یہ طریقہ اردو یا فارسی لغات میں ہندوستان میں ابھی تک کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔

اردو دہلی: طلبہ کے لئے بہت کارآمد ہے۔

ہمایوں لاہور: خویشگی صاحب نے زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ اہلِ علم کو اس کی پوری پوری قدر کرنی چاہیئے۔

ادبی دنیا لاہور: اردو زبان کے مشتاق اس لغت کی قدردانی کریں گے۔ اس سے بڑھ کر آرام دہ لغت انہیں اور نہ مل سکے گی۔

شاہکار لاہور: مولوی عبداللہ خانصاحب کے یہ قابلِ قدر فرہنگ مرتب کر کے زبان پر ایک بڑا احسان

کیا ہے۔ ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کی بہت قدر ہوگی۔

نگار لکھنؤ: ملک کو جناب محمد عبداللہ خاں خویشگی کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے یہ قابل قدر فرہنگ مرتب کر کے طلبہ کی بڑی ضرورت کو پورا کیا۔

سب رس حیدرآباد: اس کے مرتب نے بہت ہی محنت کے ساتھ یہ خدمت انجام دی ہے۔

ساقی دہلی: فرہنگ عامرہ سے بہتر اردو لغت ملنی ناممکن ہے۔

حریم لکھنؤ: یہ بات ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں اب تک اس قدر جامع اور کار آمد لغت نہیں شائع ہوئی ہے۔

اضطراب بنارس: یہ لغت بہت کار آمد ہے۔

زیب النساء لاہور: اس لغت کو خریدنے کے بعد آپ کی لائبریری لغت کے لحاظ سے مکمل ہو جائے گی۔

طلوع اسلام دہلی: یہ فرہنگ ہماری موجودہ ضروریات کو بڑی حد تک پورا کرے گا۔

ہمجولی دہلی: جو لوگ لغت کی کتاب خریدنے والے ہوں وہ فرہنگ عامرہ کو کم سے کم دیکھ ضرور لیں۔ گمان غالب یہی ہے کہ وہ اسی کو خریدنا پسند کریں گے۔

قلم حیدرآباد: یہ بہت جامع و مانع اور بہترین لغت ہے۔

عالمگیر لاہور: مرتب نے انتہائی عرقریزی اور شبانہ روز کاوش سے کام لیا ہے۔

اولڈ بوائے علی گڑھ: اس قابل قدر لغات کو صوبجات سرحد، سندھ، بنگال، اور مملکت آصفیہ میں علی الخصوص رواج دینے کی ضرورت ہے، جہاں آج کل اردو اشاعت پذیر ہے۔

ماہ نیم ماہ دہلی: وہ تمام حضرات جو اردو زبان سے دلچسپی رکھتے ہیں اس لغت سے ضرور استفادہ کریں۔

کامیاب دہلی: حامیان اردو اس انتہائی مفید کارنامہ کی قدر کریں گے۔

زمانہ کانپور: اس فرہنگ میں بہت سی خوبیاں ہیں۔

کہکشاں دہلی: فرہنگ عامرہ مفید، دلکش، اور آسان لغت ہے۔

عصمت دہلی: اس کے اندر ایسی خصوصیات ہیں جو تمام دوسری لغات سے ممتاز کرتی ہیں۔

نیرنگ خیال لاہور: یہ جدید طرز کا لغت مڈل اور ہائی کلاسوں کے لئے بیحد مفید ثابت ہوگا۔

محشر خیال دہلی: مؤلفین مصنفین اور شائقین ادب اردو کے لئے فرہنگ عامرہ ایک ضروری کتاب ہے۔

فہرست مصنفین اردو دہلی: یہ لغت نہایت جامع اور پُر از معلومات ہے۔

روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات

پارس لاہور: یہ فرہنگ شعرار، ادبار، مضامین نگاروں، خطیبوں، طلبار اور اساتذہ، غرض ہر طبقہ، ہر جماعت، اور ہر مذاق کے لوگوں کے علمی خزانوں میں اضافہ کرنے کی پوری استعداد رکھتی ہے۔

صداقت کانپور: یہ لغت اردو اور فارسی زبانوں کے طلبہ اور معلمین دونوں کے لئے نہایت مفید ہے۔

ایسٹرن ٹائمس لاہور: یہ کتاب ایک فاضلانہ تالیف ہے۔

اداکار لاہور: کالجوں اور اسکولوں کے طلبار کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

ہمدم لکھنؤ: یہ لغت سوسائٹی کے ہر طبقہ کے لئے یکساں مفید ہے۔

نوائے وطن دہلی: فرہنگ عامرہ عبداللہ خانصاحب خویشگی کے دماغ کی معنوی کا کامیاب نتیجہ ہے۔

نگار خانہ دہلی: اس کتاب کی ترتیب قابل صد ستائش و داد ہے۔

حق لکھنؤ: جدت، ندرت، اور بلاغت کی وہ تمام مثالیں جو کسی ذخیرۂ لغت کے لئے ضروری ہو سکتی ہیں، فرہنگ عامرہ میں ایک ایک لفظ کے ساتھ موجود ہیں۔

پیام حیدر آباد: فرہنگ عامرہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔

مدینہ بجنور: یہ فرہنگ بہترین رہبر کا کام دے سکتی ہے۔

تہذیب النسواں لاہور: اس لغات کے اشاعت کے جدید اردو اور فارسی الفاظ پر اس قسم کے اعتراضات کا سلسلہ بند ہو جائیگا کہ ان کی مکتوبی صورت اور ملفوظی صورت میں کوئی تطابق نہیں۔

انجام دہلی: خویشگی صاحب نے اردو زبان پر احسان عظیم کیا ہے۔

انصاری دہلی: ضرورت ہے کہ اس فرہنگ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جاوے۔

اتاترک دہلی: اس کتاب کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ریاست دہلی: یہ کتاب اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے بہت دلکش ہے۔

جدت مراد آباد: کسی اردو داں شخص کا گھر اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔

مشیر دکن حیدر آباد: ہر اردو داں کیلئے نہایت ضروری ہے کہ اس لغت کا ایک نسخہ اپنے پاس رکھے۔

عصرِ جدید کلکتہ : اتنی جامع لغت کی کتاب شاید اب تک ہماری نظر سے نہیں گذری ہے۔

تیج ویکلی دہلی : فرہنگ عامرہ اردو میں نئے طرز کی ایک مکمل لغت ہے۔

اردوئے معلیٰ کانپور : مرتب نے انتہائی عرق ریزی اور کاوش سے کام لیا ہے۔

ملاپ لاہور : ہمیں امید ہے کہ اہلِ ذوق اس کاوش کی قدر کر کے حسنِ ذوق کا ثبوت دیں گے۔

منادی دہلی : عبداللہ خاں صاحب کی اس کاوش کی قدر کرنی چاہیئے۔

الامان دہلی : فرہنگ عامرہ سے بہتر کوئی لغت اب تک ملک میں تالیف نہیں ہوئی۔

سرگذشت علی گڈھ : یہ نہ صرف ماہرینِ زبان کے واسطے ایک مفید ذخیرہ ہے بلکہ معمولی لکھے پڑھوں کے واسطے بھی حد درجہ مفید ہے۔

قومی گزٹ غازی آباد : ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ فرہنگ عامرہ کو دیکھ کر ہر صاحبِ ذوقِ سلیم خریدے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وطن دہلی : آپ نے فرہنگ عامرہ جیسی جامع لغت تدوین فرما کر درحقیقت اردو علم و ادب کی شاندار خدمت انجام دی ہے۔

شہباز لاہور : اردو زبان میں ایسی فرہنگ تقریباً کمیاب ہے۔

انقلاب لاہور : فرہنگ عامرہ بہت مقبولیت حاصل کرے گی۔

احسان لاہور : مؤلف نے اردو زبان پر ایک غیر فانی احسان کیا ہے۔

زمیندار لاہور : یہ کتاب جدید اردو لغات میں بلند پایہ اضافہ ہے۔

پرتاپ لاہور : یہ مجموعہ پوری کاوش اور محنت کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔

ہند کلکتہ : آپ نے زبان پر یہ بہت بڑا احسان کیا ہے۔

سرپنچ لکھنؤ : فرہنگ عامرہ کی تالیف ایک کارنامۂ عظیم ہے۔

پیسہ اخبار لاہور : یہ لغات بڑی مفید ہے۔

خیام لاہور : ہم مصنف کو اس مہتم بالشان کارنامہ پر مبارک باد دیتے ہیں۔

نگارستان دہلی : اس قابلِ قدر لغات کو ہر جگہ رواج دینے کی ضرورت ہے۔

ندیم بھوپال : حامیانِ اردو کے پاس اس کی ایک کاپی ہونا ضروری ہے۔

ہندوستان لکھنؤ: اردو کے ہر قدردان کو اپنے کتب خانہ میں یہ کتاب رکھنی چاہیئے۔
گوردو گھنٹال لاہور: اس کتاب کی خوبیاں مجبور کرتی ہیں کہ ہر شخص کی میز پر ضرور رہونی چاہیئے۔
پیغامِ وطن دہلی: مصنف ممدوح نے دنیائے اردو پر احسان کیا ہے۔
دیش سماچار دہلی: اب تک ہمارے یہاں کوئی ایسی لغت موجود نہیں تھی۔
دین دنیا دہلی: فرہنگ عامرہ بہت جلد مقبولیت حاصل کرے گی۔
ہندوستان ریویو پٹنہ: یہ کتاب بلاشبہہ گہری کاوش اور تدقیق کا ثمرہ ہے۔
حقیقت لکھنؤ: ہم بہت زور کے ساتھ سفارش کرتے ہیں کہ سررشتۂ تعلیم میں اس کو منظور کرکے مولف کی ہمت افزائی کی جاوے۔
ذوالقرنین بدایوں: فرہنگ عامرہ اچھا کام دے گی۔
کتاب نما جامعہ ملیہ دہلی: اس میں شک نہیں کہ یہ ایک اہم تصنیف ہے۔
سوراجیہ دہلی: خانصاحب موصوف نے اپنے کارنامہ سے اردو زبان میں نئے سرے سے جان ڈال دی ہے۔
انوکھی دنیا لاہور: فرہنگ عامرہ کی موجودگی میں کسی دوسرے لغت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ہے۔
منشور دہلی: یہ فرہنگ طلبہ کے لئے اور ان سب کے لئے مفید ہے جو مطالعہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔
نیشنل گزٹ دہلی: حامیانِ اردو کو یہ کتاب خریدنا اور اس کو ملک میں رواج دینا چاہیئے۔
خضر راہ لاہور: مولوی عبداللہ خانصاحب نے اردو زبان کی گرانقدر خدمت سرانجام دی ہے۔
عزیز ہند جھانسی: علاوہ محسن باطنی کتاب میں ظاہری خوبیاں اور دلکشی بھی موجود ہے۔
نیشنل کانگریس لاہور: اردو زبان میں ایسے لغت تقریباً ہیں ہی نہیں۔ اس لغت کا غیر معمولی گرمجوشی سے استقبال کیا جائیگا۔

مرقعِ رباعیات: اردو زبان کے چالیس شعرائے متقدمین اور متوسطین کی رباعیوں کا نچوڑ ہے۔ رباعی اصنافِ نظم میں اظہارِ تخیل کا مؤثر اور دلپذیر وسیلہ ہے۔ کتاب کو باعتبارِ تنوعِ مضامین مختلف فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر فصل کے اندر مختلف اساتذہ کی متحد المضامین رباعیاں اپنے مستقل عنوانات کے ماتحت یکجائی جمع کی گئی ہیں۔

اس ترتیب و تبویب سے چند فائدے متصوّر ہیں: اولاً قارئین کو صحیح اندازہ ہو کہ ایک ہی بات کتنے مختلف مگر دلکش پیرایوں میں بیان ہو سکتی ہے، نیز ہر صاحب کلام نے ایک مضمون میں اپنے مخصوص پیرایۂ بیان اور مقبول حسن ادا سے کیا کیا آفرینیاں کی ہیں، ایسے ادبی شاہکاروں کا مطالعہ زبان پر قدرت، تخیل میں وسعت، اور قوائے ذہنی کے ارتقار کا موجب ہوگا! ثانیاً جو موضوع پسند خاطر نہ ہو، اس کو بآسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

رباعیوں کو ردیف وار مرتب کرنے کا قدیم طریقہ ترک کر دیا گیا ہے، اور اپنے اپنے عنوانات کے تحت میں ہر رباعی کی ترتیب کتب لغات، کے اصول کے مطابق شروع حرف تہجی پر رکھی گئی ہے۔ یہ جدت رباعی مطلوب تلاش کرنے میں بہت زیادہ معین ہوگی۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

دوستی

حالی

تا زیست وہ محوِ نقشِ موہوم رہے | جو طالب دوستانِ معصوم رہے
احباب سے بات بات پر جو بگڑے | صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

مومن

تو گل ہے اگر، تو سب کی غمخواری کر | دشمن کی بھی مومنؔ نہ دل آزاری کر
ہر دم رہے احباب کی الفت کا خیال | دل ہیں یہ حباب! ان کی ہواداری کر

مآلِ کارِ علم

ذوق

اس جہل کا ہے ذوقؔ! ٹھکانا کچھ بھی | دانش نے کیا ادل کو نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے، علم سے کچھ جانیں گے | جانا تو یہ جانا، کہ نہ جانا کچھ بھی

حالی

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر | آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر
عالم کو ہے علم، اپنی نادانی کا | جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر!

ملنے کا پتہ:۔ **محمد عبداللہ خاں خویشگی، فیروز منزل جامع مسجد خورجہ (یوپی)**

مقالاتِ سرسیّد

ed. A.B.